Regd. L. No. 7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1981

سوچا کرو

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلی فون نمبر
۸۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان -/۳۶ روپے
غیر ممالک -/۸۶ روپے

قیمت فی پرچہ
۳
تین روپے

جلد ۳۴ || **اگست سنہ ۱۹۸۱ء** || **شمارہ ۸**

فہرست

۱۔ لمعات ۔۔۔ (۱۴ راگست کی یاد میں) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲
۲۔ حج کا مقصد ۔۔۔۔۔۔ (پرویز صاحب) ۔۔۔۔۔۔ ۱۰
۳۔ کچھ قرآنک کالج کے متعلق۔ (سیکرٹری احباب سوسائٹی و خازن ایجوکیشن سوسائٹی) ۲۱
۴۔ فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ۔۔۔۔۔۔۔ ۲۴
۵۔ حقائق و عبر ۔۔۔۔۔ (۱) صدرِ مملکت نے فرمایا ۔۔۔۔۔۔ ۲۵
۔۔۔ (۲) ایک حدیث ۔۔۔ (۳) نیشنلسٹ علماء کے دلائل! ۔۔۔
۔۔۔ (۴) مولانا قورآنی اور (کالعدم) جماعتِ اسلامی۔ (۵) ایران کا اسلامی نظام! ۔۔۔
۔۔۔ (۶) مرتد کی سزا ۔۔۔ (۷) منجم اور مشائخ! ۔۔۔
۶۔ جرم کرو ۔ اور ۔ سزا نہ پاؤ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۳
۷۔ سوچا کرو ۔۔۔۔۔ (پرویز صاحب کا ایک فکر انگیز مقالہ) ۔۔۔ ۴۱
۸۔ قرآنی درس کے اعلانات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۴

[illegible] مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹ رایبک روڈ۔ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

(۱۴ اگست کی یاد میں!)

گردشِ لیل و نہار کے حسابی اور میکانکی نظام کی رُو سے، چند دنوں کے بعد، ایک بار پھر ۱۴ اگست سامنے آنے والی ہے۔ تغیّراتِ احوال کی ستم ظریفی بھی عجیب حیرت فروش ہوتی ہے۔ واقعہ وہی ہوتا ہے لیکن اس کے تاثرات یکسر بدل جاتے ہیں۔ کبھی اس تقریب کی آمد آمد سے کیفیت یہ ہو جایا کرتی تھی کہ:ؔ

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں　　پھر تصوّر نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

اور اب یہ عالم ہے کہ:ؔ

یاد اس کی آئی، غم تازہ ہوا　　غم کسے کہتے ہیں؟ اندازہ ہوا

قوموں کی تاریخ میں اس قسم کے تغیّرات کہیں صدیوں میں جا کر نمودار ہوتے ہیں، لیکن یہ شاید اس "اٹامک ایج" کا اثر ہے کہ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم عیدِ آزادی کا جشن منایا کرتے تھے، اور آج یہ حالت ہے کہ اس تقریب پر ہر قلبِ حسّاس پکار اٹھتا ہے کہ:ؔ

یہ گُٹی گُٹی سی بہار کیوں ہے، کہاں وہ جانِ بہار ہے؟
یہ چمن سے کون چلا گیا، کہ کلی کلی کو فشار ہے!

لیکن اس سوگواریٔ بہار کے باوجود، طلوعِ اسلام اپنی اس ذمہ داری کو فراموش نہیں کر سکتا کہ ان بھولے ہوئے افسانوں کی یاد تازہ کراتا رہے۔

(۰)

تحریکِ پاکستان کے دوران کانگریس کے ہمنوا، بار بار قائدِ اعظمؒ سے کہتے تھے کہ جب ہمارا مقصد بھی حصولِ آزادی ہے اور آپ کا مقصد بھی وہی، تو آپ کو ایک الگ تنظیم قائم کرنے اور جداگانہ تحریک چلانے کی ضرورت کیا ہے؟ آپ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیے۔ ہم دونوں مل کر، انگریز کو یہاں سے نکال کر آزادی حاصل کریں گے اور نظامِ جمہوریت کی رُو سے عوام کی حکومت قائم کریں گے جس میں تمام باشندگانِ ملک کو یکساں آزادی حاصل ہو گی۔ اس کے جواب میں (پہلے علامہ اقبالؒ اور ان کے بعد) قائدِ اعظمؒ ان سے کہتے تھے کہ لفظی طور پر تو آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن جہاں تک لفظ آزادی کے مفہوم کا تعلق ہے، وہ آپ کے اور ہمارے نزدیک ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ آپ کے

نزدیک آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ انگریز یہاں سے چلا جائے اور اہلِ ہند اپنی حکومت آپ قائم کرلیں۔ لیکن ہمارے نزدیک آزادی کا مفہوم و مقصود اس سے مختلف ہے۔ اور وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت قائم نہ ہو جائے۔ (بالفاظِ دیگر) وہ ان سے کہتے تھے کہ تمہارے نزدیک "آزاد مملکت" کا قیام مقصود بالذات ہے اور ہمارے نزدیک، آزاد مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کا منتہیٰ ہے۔ اور یہ منتہیٰ تھا اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی۔ یہی وہ نقطہ تھا جو درحقیقت مابہ النزاع تھا۔ ساری جنگ اسی محور کے ..... گرد لڑی گئی تھی۔ اور اس میں فریقِ مقابل تھا نیشنلسٹ علماء کا گروہ۔ قائدِ اعظمؒ کا دستِ تدبر، ہندو کی شاطرانہ عیاری کا نقاب بڑی آسانی سے اُلٹ دیتا تھا۔ ان کا حسنِ استدلال، انگریز کے اعتراضات کا بھی بڑا مسکت جواب دیتا تھا۔ لیکن علماء حضرات، طرح طرح کی مغالطہ آفرینیوں سے، عوام کے جذبات کو مشتعل کرتے تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ نہ اقبالؒ عوامی سطح پر جذبات کی لڑائی لڑنا جانتے تھے نہ قائدِ اعظمؒ۔ اس زمانے میں، عوام کے دلوں میں انگریز کے خلاف نفرت اس قدر شدید تھی کہ اگر کسی کے خلاف کہہ دیا جاتا کہ وہ انگریز نواز ہے تو عوام "توڈی بچہ ہائے ہائے" سے اس کی زندگی اجیرن کر دیتے۔ انہوں نے اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ، دونوں کے متعلق یہ مشہور کر رکھا تھا کہ یہ انگریز کے پٹھو ہیں، اور تحریکِ پاکستان انگریز کی سازش کی تخلیق ہے۔ (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اس باب میں پیش پیش تھے۔ وہ کہتے تھے:-

> جو لوگ مسلمانوں کو اس میدانِ سیاست (یعنی کانگریسی میدانِ سیاست) میں اُترنے سے روک رہے ہیں اور متحدہ قومیت کی بھیانک صورت ظاہر کر کے نفرت دلا رہے ہیں، بلاشک و شبہ برطانیہ کی ایسی عظیم الشان خدمات سرانجام دے رہے ہیں جو اس کی افواج اور اسلحہ سے بھی انجام نہیں پا سکتیں۔ (پمفلٹ متحدہ قومیت اور اسلام۔ ص۷)

حتیٰ کہ انہوں نے حضرت علامہؒ کا نام لے کر کہا:-

> غرضیکہ جادوگرانِ برطانیہ نے اپنی ساحرانہ کارگزاریوں سے سرسید جیسے تجربہ کار عقلمند شخص کو نہ صرف متحدہ قومیت سے بلکہ پالیٹکس اور آئینی جدوجہد سے بھی روکا، اور اسی کے ذریعے سے مسلمانوں کو ہمیشہ سیاسیات سے الگ رکھوا کر بالکل نابلد اور ڈرپوک بنا دیا۔ پھر اگر ڈاکٹر اقبالؒ مرحوم اس سحر سے مسحور ہیں تو کیا تعجب ہے۔ (ایضاً۔ ص۷)

جب انہوں نے "مسئلہ قومیت" کے سلسلے میں علامہ اقبالؒ کے ساتھ اپنی بحث میں اسی الزام کو دہرایا تو انہوں نے اس کے جواب میں کہا تھا:-

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ اوّلین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام

میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد بھی انہی اصولوں پر ہو جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بدتر بن جائے، تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب حرام سمجھتا ہوں قطعاً حرام۔ (معرکۂ دین و وطن)

یہ الزامات ویسے ہی بڑے پوچ تھے۔ پھر واقعات ان کی اس طرح تردید کرتے گئے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ غیر مؤثر ہو گئے۔ اس کے بعد، ان حضرات نے اپنے ترکش کا آخری تیر نکالا اور کہا کہ مطالبۂ پاکستان کے حق میں جو یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس مملکت میں مسلمان اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے، تو یہ دلیل بڑی بودی اور مغالطہ آفریں ہے۔ آزاد ہندوستان میں، مسلمانوں کے لئے اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔ انہیں اعتقادات کی پوری پوری آزادی ہو گی۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے احکام و فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہو گی۔ انہیں شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) پر عمل پیرا ہونے کی آزادی ہو گی ـــ یعنی ان کے نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق معاملات شریعت کے مطابق طے ہوں گے۔ جب یہاں مسلمانوں کو شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اس قدر آزادی ہو گی تو پھر ایک الگ مملکت قائم کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ یہ ڈھونگ ہے۔ جناح کے وکیلانہ حربے ہیں۔ ہندوستان میں اسلام کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔

ان کا یہ پراپیگنڈہ بڑا کارگر ثابت ہوتا تھا، اس لئے عوام (تو ایک طرف، عام تعلیم یافتہ) خواص تک کو یہ سمجھانا بڑا مشکل تھا کہ اسلام، اسی کا نام نہیں جسے یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ اسلام (بہ حیثیت نظامِ زندگی کے) اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، جس کی ہندوستان میں تو ایک طرف، دنیا کی کسی غیر اسلامی مملکت میں بھی آزادی نہیں مل سکتی۔ اسی حقیقت کو اقبالؔ نے ان مختصر الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

ملاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت   ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ تھی بنیادی وجہ نزاع اور بنائے اختلاف۔ آپ طلوعِ اسلام کے اس دور کے فائل اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو صفحات کے صفحات اسی بحث سے لبریز نظر آئیں گے۔ اصل یہ ہے کہ یہ سوال تھا بھی بڑا لطیف اور دقیق۔ مسلمان ہزار سال سے اُسی اسلام کو حقیقی اسلام سمجھتا چلا آ رہا تھا جسے یہ (علماء) حضرات اسلام کے نام سے پیش کرتے تھے اور جس کی آزادی کی ضمانت ہندو دے رہا تھا۔ سوال یہی نہیں تھا کہ جس قدر اسلام، یہ حضرات پیش کرتے تھے، اسلام اتنا ہی نہیں۔ جو کچھ بھی اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا تھا اس میں اس قدر غیر اسلامی (عجمی) عناصر شامل ہو چکے تھے کہ اصلی اسلام اس ملبہ کے نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ مدفون اسلام کو اس ملبہ سے باہر نکالنا، بڑی کوہکنی اور خارہ شگافی چاہتا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے الٰہ آباد کے خطبہ میں کہا تھا کہ پاکستان کی اسلامی مملکت کے قیام سے مقصود یہ ہے کہ اس سے اسلام پر سے وہ نقش

مٹا دیا جا سکے گا جو عربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر رکھا ہے۔ اس نقش کو مٹانا (بقول سعید حلیم پاشا کے الفاظ میں، اس قیصر کو کھرچنا) بڑا ہمت طلب مرحلہ تھا، بالخصوص جب مذہبی پیشوائیت پوری شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کرتی ہو اور اس کی پشت پر ہندو کی پوری تائید اور امداد موجود ہو۔

ان مخالفین میں اکثریت تو ان کی تھی جو دیانتداری (لیکن بربنائے جہالت) اسی اسلام کو حقیقی اسلام سمجھتے تھے جو اُمت میں متوارث چلا آ رہا تھا۔ لیکن ایک عنصر ایسا بھی تھا جو اپنے مخصوص مقاصد کے پیشِ نظر اقبالؒ یا قائدِ اعظمؒ کے پیش کردہ اسلام کی مخالفت کرتا تھا۔ اور یہی طبقہ زیادہ مؤثر اور فعّال تھا۔ وہ اسلام جسے یہ حضرات پیش کرتے تھے، اس میں، اپنے دائرے کے اندر ان کی اپنی حکومت قائم رہتی تھی۔ یعنی قوم اپنے مذہبی معاملات کے لئے ان کے فیصلوں اور فتوؤں کی محتاج رہتی تھی۔ انہیں یہ اقتدار انگریز کے زمانے میں بھی حاصل تھا اور ہندو بھی اسے قائم رکھنے کی ضمانت دیتا تھا۔ اس کے برعکس حقیقی اسلام میں ان کا یہ اقتدار (بلکہ جداگانہ وجود ہی) ختم ہو جاتا تھا۔ یعنی اُس اسلام میں تھیاکریسی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس باب میں نہ علامہ اقبالؒ نے کسی قسم کی مداہنت سے کام لیا، نہ قائدِ اعظمؒ نے۔ انہوں نے نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں (بار بار) اس حقیقت کا اعلان کیا کہ پاکستان میں تھیاکریسی قطعاً نہیں ہوگی۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبۂ الٰہ آباد سے بھی بہت پہلے، (مولانا) اکبر شاہ (نجیب آبادی) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا:-

> آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ ور مولویوں کا اثر سرسید احمد خاں کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتوؤں کی خاطر اُن کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ انشاءاللہ شائع ہوگا۔ مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔ بہرحال اس تمام معاملے کے متعلق مفصّل گفتگو ہوگی جب آپ لاہور تشریف لائیں گے۔ ہندوستان میں بالخصوص آج کل بہت سمجھ سوچ کر قدم اٹھانا ہوگا۔
>
> (انوارِ اقبالؒ۔ شائع کردہ اقبالؒ اکیڈمی۔ صفحہ ۱۳۱)

انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے ایک بیان میں جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی ۲۳ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:-

> تمہارے دین کی یہ عظیم الشان ملی فطری تمنّا اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے، اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قیدخانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت

کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ مئی ۱۹۷۸ء)

یہ تو ان کے نثری بیانات کے اقتباس ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جو کچھ اور جس قدر "مُلّا" کے خلاف کہا ہے وہ درحقیقت "مُلّا" کے تصور کے اسلام اور تھیاکریسی کے خلاف جہاد ہے۔

اقبالؒ کے بعد قائدِ اعظمؒ کی طرف آیئے تو انہوں نے بھی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف الفاظ میں کہا کہ تحریکِ پاکستان کا اہم مقصد، قوم کو مذہبی پیشوائیت کے رجعت پسندانہ اسلام کے چنگل سے نجات دلانا ہے۔ انہوں نے ۵ فروری ۱۹۳۸ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے، نوجوان طالبعلموں سے کہا:

> مسلم لیگ نے کم از کم ایک کام تو کر دیا ہے، اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرستانہ کھیل، کھیل رہے ہیں، وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس نے بلاشک و شبہ تمہیں اس ناخوش آئند و غیر مطلوب عنصر کی جکڑبندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔ (تقاریرِ قائدِ اعظمؒ حصہ اول ص ۴۲۵)

انہوں نے، ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں، مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک اسٹیٹ بنانا نہیں چاہتے۔
>
> (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص ۳۸۶)

انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی، اس حقیقت کو علی الاعلان واضح کیا تھا کہ پاکستان میں مذہبی پیشواؤں کی حکومت نہیں ہوگی۔ انہوں نے، فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا تھا:

> پاکستان کی مجلسِ آئین ساز نے ابھی پاکستان کا دستور مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ (تقاریرِ بحیثیت گورنر جنرل۔ ص ۶۵)

علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی ان تصریحات کے بعد یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ علماء حضرات مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کیوں کرتے تھے۔ یہ اسلام کا سوال نہیں تھا۔ ان کے ذاتی اقتدار کا سوال تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اقتدار جو انہیں مسلمان سلاطین کی ہزار سالہ سیکولر حکومت کے تحت حاصل رہا۔ جسے انگریز نے بھی اپنے عہدِ حکومت

میں برقرار رکھا اور جسے علیٰ حالہٖ رکھنے کی ضمانت ہندو دے رہا تھا، پاکستان میں (صحیح معنوں میں) اسلامی حکومت میں، نہ صرف یہ کہ وہ ان سے چھین جائے گا، بلکہ ان کا جداگانہ تشخص بھی باقی نہیں رہے گا۔ بنابریں فطری طور پر ان کی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ پاکستان وجود میں نہ آنے پائے۔

اقبالؒ یا قائدِ اعظمؒ نے یہی نہیں کہا تھا کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ انہوں نے مثبت طور پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اُس مملکت میں، حکومت قرآن کے مطابق قائم ہوگی۔ علامہ اقبالؒ کا تو خیر سارا کلام اسی نقطہ کی وضاحت ہے کہ اسلامی حکومت، قرآن کی حکمرانی کا نام ہے جو حسبنا کتاب اللہ، کہنے والوں کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے، قائدِ اعظمؒ نے بھی اس باب میں کسی قسم کا شک و شبہ یا ابہام نہیں رہنے دیا تھا۔ حیدر آباد (دکن) میں ان کا وہ اعلان، جو طلوعِ اسلام کے صفحات پر بار بار شائع ہوتا چلا آرہا ہے، اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا:۔

> اسلامی مملکت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔
>
> (طلوعِ اسلام۔ اپریل ۱۹۴۷ء)

اس پر وہاں کے طلباء نے (جنہیں یہ انٹرویو دیا گیا تھا) کہا کہ جب یہ صورت ہے تو پھر مسلم لیگ اپنی تحریک کی مذہبی تعبیر و تشریح کیوں نہیں کرتی۔ اس کے جواب میں، قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا:۔

> وقت یہ ہے کہ جب اس جدّوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیمِ عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں، ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے اور اپنے حلقہ سے باہر، اہلیت و استعداد کے باوجود، مجھ میں یا آپ میں، یعنی اپنے سوا کسی اور میں، اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجاآوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں میں ان مولوی صاحبان میں (الّا ماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ اور (مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

(۰)

ان علماء نے تحریکِ پاکستان کے دوران اپنی مخالفت مسلسل جاری رکھی۔ لیکن جب ان کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا تو انہوں نے ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ یہ ہجوم کر کے پاکستان آگئے۔ واضح رہے کہ ان علماء میں گنتی کے چند ایسے تھے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔ ان کی معتدبہ اکثریت اس

مخالفین کی تھی۔ یہ پاکستان آگئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے مطالبہ شروع کر دیا کہ

(۱) پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔

(۲) لہٰذا، یہاں اسلامی قوانین نافذ کرو۔

(۳) اسلامی احکام و قوانین کا علم اربابِ حکومت کو نہیں، علماء کو ہے۔ لہٰذا زمامِ اقتدار علماء کے ہاتھ میں دو۔

یعنی ہندوستان میں رہتے ہوئے اگر ان کا اقتدار، نماز، روزہ یا شخصی قوانین تک محدود رہتا تھا، تو یہاں اُن کے عزائم پوری کی پوری حکومت پر قبضہ کرنا تھا۔ جب مودودی مرحوم سے کہا گیا تھا کہ اسلامی نظام یا دستور مرتب نہیں ہو رہا، تو انہوں نے کہا تھا کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں دو جو جانتے ہیں کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ پھر دیکھو یہ نظام اور دستور کس طرح مرتب نہیں ہوتا!

اگر اقبالؒ یا قائدِ اعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ ان کے اس مطالبہ کا جواب ویسے ہی دیتے، جیسے وہ تحریکِ پاکستان کے دوران دیا کرتے تھے ——— یعنی وہ قرآنی دستور و نظام مرتب کر کے دے دیتے۔ لیکن (قوم اور اس مملکت کی بدقسمتی تھی کہ) وہ اس سے پہلے ہی دنیا سے چلے گئے۔

ہم گذشتہ تیس سال کے اربابِ اقتدار میں سے کسی کی بھی مدافعت نہیں کرنا چاہتے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ جانتے تھے کہ جسے یہ حضرات اسلامی قوانین کہہ کر پکارتے ہیں، وہ اس دور میں ناممکن العمل ہیں۔ لہٰذا، وہ اس مطالبہ کو منظور نہیں کرتے تھے۔ اس سے انہیں ان کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کا نہایت عمدہ موقعہ ہاتھ آجاتا تھا ——— اور پراپیگنڈہ کی جس قدر منظم اور مؤثر مشینری ان حضرات کے پاس ہے، دنیا کی کوئی حکومت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آپ ذرا اس پر نگاہ ڈالئے کہ پاکستان کے ہر گاؤں۔ ہر قصبہ، ہر قریہ۔ ہر شہر، اور اس کی ہر گلی اور ہر محلہ میں مسجد (بلکہ مسجدیں) موجود ہیں۔ ان میں روزانہ پانچ مرتبہ اور ہر ہفتہ، کسی اعلان، اشتہار یا دعوت کے بغیر لوگ ازخود جمع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا، جس بات کو یہ پھیلانا چاہیں وہ ایک دن میں، بیک وقت، ملک کے کونے کونے تک پہنچ جاتی ہے۔ سوچئے کہ اس جیسی منظم پراپیگنڈہ کی مشینری دنیا کی کسی حکومت کے پاس بھی ہے؟ اس مشینری کی رُو سے یہ حضرات ہر حکومت کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے رہے کہ اربابِ اقتدار ملحد ہیں۔ بے دین ہیں۔ فاسق و فاجر ہیں۔ یہ احکام شریعت نافذ نہیں کرنا چاہتے۔

ان کا مطالبہ کس طرح ناممکن العمل تھا اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ یہ آج تک پکارتے چلے آرہے ہیں کہ ۱۹۵۱ء میں، ملک کے تمام فرقوں کے نمائندہ علماء نے ایک متفقہ منشور شائع کیا تھا جس میں اسلامی نظام اور شریعت کی وضاحت کی گئی تھی اور اس کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس منشور میں "متفق علیہ" مطالبہ یہ تھا کہ ملک کے قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں۔ بیس سال تک یہ حضرات اس مطالبہ کو دہراتے رہے اور ہر حکومت کو کوستے رہے کہ یہ لوگ "کتاب و سنت" کے مطابق قوانین مرتب نہیں کرتے۔ بیس سال کے مسلسل پراپیگنڈہ کے بعد، اس منشور پر دستخط کرنے والوں میں سے (اگر سب سے زیادہ مشہور نہیں، تو مشہور تر) شخصیت، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے

اعتراف اور اعلان کیا کہ کتاب و سنت کے مطابق پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔

یعنی جب اربابِ حکومت اس مطالبہ کو ناممکن العمل کہتے تھے تو انہیں ملحد و بے دین کہا جاتا تھا۔ لیکن جب مودودی (مرحوم) نے اسے ناممکن العمل قرار دیا تو ان میں سے کسی نے ان کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا، اس لئے کہ سب جانتے تھے کہ مودودی (مرحوم) نے ٹھیک کہا ہے۔ یہ مطالبہ واقعی ناممکن العمل ہے!

جب مودودی (مرحوم) سے پوچھا گیا کہ اگر کتاب و سنت کے مطابق کوئی متفق علیہ ضابطہ، قوانین مرتب نہیں ہو سکتا تو پھر کیا کیا جائے؟ انہوں نے کہا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ (حالانکہ اس فقہ کو وہ خود "منجمد شاستر" قرار دے چکے تھے)۔ چونکہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت کرنے والے علماء کی اکثریت فقہ حنفی کی پابند تھی، اس لئے انہوں نے اس تجویز کا بڑھ چڑھ کر استقبال کیا۔ اس طرح یہاں وہ مقتدا کریسی مسلط ہو گئی جسے ختم کرنے کے لئے حصولِ پاکستان کے لئے جدوجہد کی گئی تھی۔ اور یوں ان علماء کی وہ شکست جو انہیں تشکیلِ پاکستان کی رُو سے اٹھانی پڑی تھی، مبدل بہ فتح ہو گئی۔ اس سے انہیں کوئی غرض نہیں کہ یہ (ہزار سال پہلے کے انسانوں کے وضع کردہ احکام) ممکن العمل بھی ہیں یا نہیں، اور جو فرقے اس فقہ کو اسلامی تسلیم نہیں کرتے، اُن کا اِن کے خلاف کیا ردِ عمل ہو گا۔ اور ملک کی سالمیت پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

یہ ہیں وہ حقائق جن کی روشنی میں ہم نے کہا تھا کہ وہ یومِ آزادی، جس کی آمد آمد کبھی روزِ عید سے بھی زیادہ وجہ شادمانی ہوتی تھی، اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

یاد اس کی آئی، غم تازہ ہوا ۔۔۔ غم کسے کہتے ہیں، اندازہ ہوا

تاہم، ہماری اب بھی یہی دعا اور کوشش ہے کہ خدا اس خطۂ زمین کو قائم و دائم اور مستحکم و پائندہ رکھے، کہ اس کے وجود کے ساتھ، قرآنی نظام کی امیدیں وابستہ ہیں۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے ۔۔۔ غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

لہٰذا، ہم اس یومِ آزادی کا بصمیمِ قلب استقبال کرتے ہیں۔

(٥)

رابطۂ باہمی:- محترم منظور احمد صاحب، تحریکِ طلوعِ اسلام سے ایک عرصہ سے وابستہ ہیں۔ اب انہوں نے بیسیُ پر جیار، اوسلو (O S L O) ناروے میں طلوعِ اسلام کی بزم قائم کی ہے۔ اور اراکینِ بزم نے انہی کو اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے۔ ہم محترم منظور احمد صاحب کو بزم کے قیام، اور اراکینِ بزم کو ان کے حسنِ انتخاب پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان جملہ احباب کے قرآنی ذوق میں مزید برکت اور استحکام عطا فرمائے تاکہ، انہوں نے ظلمت کدۂ مغرب میں جس قرآنی شمع کو روشن کیا ہے، اس کی کرنیں دُور دُور تک پھیلتی جائیں۔ ادارہ اس بزم کی باقاعدہ توثیق کرتا ہے۔

(ناظم ادارہ)

ایک درس

حج کا مقصد

پرویز

آپ نے یہ الفاظ ہر محراب و منبر اور ہر سٹیج اور پلیٹ فارم سے سُنے ہوں گے، اور بار بار سُنے ہوں گے کہ اسلام نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ الفاظ تو آپ نے بارہا سُنے ہوں گے، لیکن یہ کسی کی زبان سے نہیں سُنا ہوگا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کیا ہیں اور اسلام ان کا حل کیا پیش کرتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ جو قوم خود اپنی مشکلات کا حل دریافت نہ کر سکتی ہو ——— اس کے لئے اُسے غیروں کے دروازے پر دستک دینی پڑتی ہو ——— وہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل کیا پیش کر سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جب غیر اقوام ہمارا یہ دعویٰ سُنتی ہیں تو استہزاء کی ہنسی ہنس کر کہتی ہیں کہ پہلے اپنی مشکلات کو تو حل کر لو، اس کے بعد نوعِ انسان کی مشکلات کے حل کا دعویٰ کرنا!

یہ درحقیقت "مذہب" کی ٹیکنیک ہے کہ وہ نہایت مقدّس اور خوش آئند الفاظ کے ذریعے اپنے معتقدین کو خوش فہمی میں مبتلا رکھتا ہے اور اُن کے ذہن کو کبھی اس طرف نہیں آنے دیتا کہ وہ ان الفاظ کا مفہوم معلوم کریں یا یہ سوچیں کہ ہم جو دعویٰ کرتے ہیں اُس کا عملی ثبوت کیا ہے۔ مذہب کا سارا دارومدار بلا مفہوم الفاظ کے دہرائے چلے جانے اور بلا نتیجہ رسومات ادا کئے جانے پر ہوتا ہے۔ چونکہ اسلام بھی الدّین نہیں رہا، مذہب بن چکا ہے، اس لئے ہم بھی نہ الفاظ کے مفہوم کی طرف آتے ہیں اور نہ ہی اپنے دعاوی کے عملی ثبوت کی طرف۔

اِس وقت تمام اقوامِ عالم گوناگوں مشکلات کا شکار ہیں۔ میں ان میں سے ایک ایک پرابلم کا حل قرآنِ مجید کی روشنی میں پیش کئے چلا آرہا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ میری یہ کوشش قرآنی الفاظ، اصطلاحات، اور تصوّرات و نظریات کا متعیّن مفہوم پیش کرنے تک محدود ہے۔ عملی نتائج سے اس کے دعاوی کا ثبوت بہم پہنچانا میرے بس کی بات نہیں، کیونکہ وہ ثبوت تو قرآنی نظام کے قیام ہی سے بہم پہنچ سکتا ہے، اور نظام کا قیام کسی فرد کے بس کی بات نہیں ہوتی، یہ اُمّت کی اجتماعی کوششوں ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ بایں ہمہ میں گذشتہ قریب تیس ۳۰ سال سے اپنی ان کوششوں کو جاری رکھے ہوئے ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ قوم کے ارباب بصیرت اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ اِس وقت ہم میں جو کچھ اسلام کے نام سے ہو رہا ہے وہ مذہب ہے، دین نہیں۔ اور دوسرے اس لئے کہ اس سے شاید آنے والی نسلیں استفادہ کر کے دین کا نظام قائم

کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اقوامِ عالم متعدد گوناگوں مشکلات اور پریشانیوں کا شکار ہیں ..... میں اس وقت ان میں سے صرف ایک مسئلہ کو لوں گا جو درحقیقت مشکل ترین مسئلہ ہے اور نوعِ انسان کے موجودہ مصائب اور ممکنہ تباہی کا موجب ہے۔ اور وہ ہے نیشنلزم۔ میں اس موضوع پر اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ خود اقوامِ مغرب اس کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہیں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کس قدر مضطرب و بے قرار۔ لیکن انہیں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں اس نشست میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ قرآنِ کریم نے اس کا نظری حل کیا بتایا اور عملی پروگرام کیا تجویز کیا۔

—— (۰) ——

نوعِ انسان کی تمدنی یا معاشرتی زندگی کی ابتداء کب اور کہاں سے ہوئی، مغرب کے علماءِ علم الانسان نے اس باب میں خاصی تحقیق کی ہے لیکن وہ اس باب میں ابھی تک کسی متعین نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ قرآنِ کریم اس قسم کی تحقیقات کے متعلق بحث نہیں کرتا۔ وہ بات اس مقام سے شروع کرتا ہے جو اس کے پیشِ نظر منزل تک پہنچنے کا آغازِ سفر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ط ...... ۰ (۱۰/۱۹) "نوعِ انسان شروع میں ایک اُمّت، ایک جماعت، ایک گروہ تھی۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں اختلاف پیدا کر لئے۔" ان اختلافات کا نتیجہ تھا کہ وہ پہلے مختلف خاندانوں میں اور اس کے بعد قبیلوں میں بٹ گئے اور اس تفرّق کو نسلوں تک پھیلا دیا۔ باہمی تقسیم اور تفریق کی یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ تاآنکہ اس نے مختلف قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ اُس نے ایک سیاسی تصورِ حیات یا مسلکِ زندگی کا پیرہن اوڑھ لیا۔ اس کا نام نیشنلزم ہے جو اس وقت پوری کی پوری نوعِ انسان کو محیط ہے۔ اِس سے نہ کرۂ ارض، کرۂ ارض رہا ہے اور نہ ہی انسان، نوعِ انسانی کا فرد۔ کرۂ ارض کو فرضی لکیریں کھینچ کر مختلف ممالک میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان ممالک میں بسنے والے انسانوں کو مختلف قوموں کا نام دے دیا گیا۔ یہ قومیں بھیڑیوں کی طرح تاک میں بیٹھی رہتی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کب اونگھ آئے اور یہ اس پر جھپٹ پڑیں۔ اس وقت پوری نوعِ انسان کی یہی کیفیت ہے، اس میں نہ اقوامِ مغرب کی تخصیص ہے اور نہ اقوامِ مشرق کی تمیز۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

نیشنلزم

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
مشرق کے ثوابت ہوں کہ مغرب کے سیّار

قرآنِ کریم نے بتایا کہ نوعِ انسان اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی جس مصیبت کا شکار ہو گئی تھی اُس سے نجات دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وحی کی راہنمائی کا آغاز کیا۔ سورۂ بقرہ میں ہے:-

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط ۵ (۲/۲۱۳)

چونکہ نوعِ انسان کو پھر سے ایک وحدت میں تبدیل کرنا مقصود تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بعثتِ انبیاء کا سلسلہ شروع کیا جو انہیں اختلافی زندگی کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوشخبری سناتے۔ وہ اپنے ساتھ قوانینِ خداوندی کا ضابطہ لاتے تاکہ وہ اُس کی رُو سے ان کے اختلافی امور کا فیصلہ کریں۔

یہ تھا وحی کا مقصد اور وہ منزل جس تک کاروانِ انسانیت کو پہنچانا مقصود تھا۔ یعنی انہیں ایک

عالمگیر برادری

عالم گیر برادری کے قالب میں ڈھالنا۔ اس کے لئے وحی نے کہا کہ جو لوگ اس مقصد سے متفق ہیں وہ، رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کے اختلاف کے باوجود ایک اُمّت کے افراد ہیں۔ جو اس سے انکار کرتے ہیں وہ ان کے بالمقابل دوسری اُمّت کے افراد۔ اسی کو ایمان اور کفر کے امتیاز سے تعبیر کیا گیا ہے، اور سیاسی اصطلاح میں اسے "دو قومی نظریہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگرچہ ہر نبی کا یہی پیغام تھا، لیکن اس کی عملی تشکیل حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں وجود پذیر ہوئی۔ اُنہوں نے ماں باپ، برادری، قوم، اور وطن تک کو چھوڑ کر ایمان کی بنیادوں پر ایک نئی اُمّت کی تشکیل کی اور اُس کا ایک اجتماعی نظام قائم کیا۔ نظام یا اجتماعیت کے لئے ایک محسوس مرکز کا وجود لابنفک ہوتا ہے۔ انہوں نے وحیِ خداوندی کی راہنمائی میں مکّہ کے مقام پر ایک علامتی مرکز تعمیر کیا، جسے کعبہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:-

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۵ (۳/۹۶)

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا گھر جو قوم، وطن، رنگ، نسل کے امتیازات سے بلند ہو کر خالص انسانیت کے لئے وجود میں لایا گیا تھا، مکّہ کی مبارک وادی میں (خانہ کعبہ) تھا۔ یہ کاروانِ انسانیت کی منزلِ مقصود کے لئے نشانِ راہ تھا۔

اسے، تمام انسانی نسبتوں سے بلند و بالا قرار دینے کے لئے، اللہ تعالیٰ نے "اپنا گھر" (بَيْتِيَ ۲/۱۲۵) کہہ کر پکارا۔ یہاں ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ ویسے تو کائنات کی ہر شے خدا ہی کی ہے۔ لیکن اس نے جس چیز کو خاص طور پر "اپنی" کہہ کر پکارا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی، نہ اس پر کسی کا قبضہ ہو سکتا ہے۔ (مثلاً) بیت اللہ (اللہ کا گھر) یا ارض اللہ (اللہ کی زمین)۔

مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ کعبہ کو النّاس (نوعِ انسان) کی اجتماعیت کا مرکز بنایا گیا۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کعبہ اور حج کے سلسلے میں جس قدر آیات قرآن کریم میں آئی ہیں اُن میں ہر جگہ "النّاس" ہی کہا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، وحیِ خداوندی کا مقصود و مطلوب

لِلنّاس کا مقصد

نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل تھا۔ اس لئے جس مقام کو اس برادری کا مرکز قرار دیا گیا اسے "لِلنّاس" ہی کہا جانا چاہیئے تھا۔ اور یہی قرآن نے کیا۔

اب یہ دیکھئے کہ نوعِ انسان کی اس مرکزیت سے مقصود کیا تھا۔ فرمایا:۔

جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ ..... ۝ (۵/۹۷)

اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو واجب الاحترام مقام قرار دیا تاکہ اس مرکزیت سے نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو سکے۔

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسانیت، قوموں میں تقسیم ہو تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر آج دنیا کی قومیں دو حصّوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک سپر نیشنز ——— یعنی بڑی مہیب قوتوں کی مالک قومیں۔ اور دوسری، کمزور اور غیر نشوونما یافتہ (UNDEVELOPED) قومیں۔ کمزور قوموں کا طاقتور قوموں کے سہارے کا محتاج ہونا تو ظاہر ہے۔ یہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو ہی نہیں سکتیں۔ لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ خود سپر پاورز اپنی قوت کے لئے ان کمزور قوموں کی محتاج ہوتی ہیں۔ جس قوم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کمزور قومیں ہوں، وہ اُتنی ہی زیادہ طاقتور سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بڑی قوم کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان کمزور قوموں کو زیادہ سے زیادہ امداد یا امداد کا لالچ دے کر اپنے ساتھ رکھ سکیں، لیکن ایسا کبھی نہ ہونے دیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں۔

لیکن اگر قومیتوں کے مٹ جانے کے بعد نوعِ انسان اُمّتِ واحدہ بن جائے تو اُسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یہ ہے کعبے کی مرکزیت کا اوّلین ثمرہ۔ یعنی قِیٰمًا لِّلنَّاس۔ نوعِ انسان کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا ذریعہ۔

اب آگے بڑھیئے۔ اِس وقت دنیا میں کہیں امن نہیں۔ چھوٹی قومیں ہوں یا بڑی، سب ایک دوسرے سے ڈری اور سہمی ہوئی رہتی ہیں۔ جب قوموں کی یہ حالت ہے تو افراد، خوف و ہراس کے جس جہنم میں زندگی گذارتے ہیں، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس وسیع و عریض کرۂ ارض پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا مامن ایسا نہیں جہاں کوئی فرد یا قوم اپنے آپ کو محفوظ یا مامون سمجھ لے۔ کعبے کی مرکزیت کی دوسری خصوصیت کے متعلق قرآن نے کہا:۔

جائے امن

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ..... ۝ (۲/۱۲۵)

اور ہم نے کعبہ کو نوعِ انسان کی اجتماعیت کا مرکز بنایا اور ایسا مقام جہاں کسی کو کسی قسم کا خوف و خطر نہ ہو۔

دوسری جگہ ہے: وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ..... ۝ (۳/۹۷) "جو بھی اس نظام میں داخل ہو جائے گا جس کا یہ مرکز ہے، اُسے امن کی ضمانت مل جائے گی۔"

بات واضح ہے، دنیا میں خوف و خطر تو مختلف قومیتوں کا پیدا کردہ ہے۔ جب ان کی جگہ ایک ایسی اُمّت وجود میں آجائے گی جس میں یہ تفریق نہیں ہوگی تو وہ بھائیوں کی طرح امن و سلامتی سے رہے گی۔ ایسے نہ کسی خارجی خطرہ کا اندیشہ ہوگا، نہ داخلی خلفشار کا ڈر۔ سوچئے کہ اس سے یہ کرۂ ارض جو اس وقت جہنم زار بن رہا ہے، کیسا امن و سلامتی کی جنّت بن جائے گا!

موجودہ قومیتوں کی تقسیم کی ایک لعنت یہ بھی ہے کہ کسی ایک ملک کا باشندہ، دوسرے ملک میں قدم تک نہیں رکھ سکتا جب تک وہ اس سے اجازت نامہ (VISA) حاصل نہ کرلے۔ کعبہ کے متعلق کہا:۔

جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ِۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ..... (۲۲/۲۵)

یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے، اس گھر کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں، کسی کو یہاں آنے کی ممانعت نہیں، کسی سے اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ تمام انسانوں کے خدا (ربّ النّاس) کا گھر ہے، اس لئے اس کے دروازے ہر انسان کے لئے کھلے رہیں گے۔

یہی نہیں کہ جس کا جی چاہے یہاں آجائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے بعد دعا یہ مانگی تھی کہ اس خطۂ زمین میں کچھ پیدا نہیں ہوتا جو لوگوں کے لئے وجہ کشش ہوسکے۔ بارِالٰہا! تو ایسا کردے کہ لوگوں کے دل اس طرف مائل ہو جائیں اور وہ فوج در فوج اِدھر آنے لگ جائیں۔ (۱۴/۳۷)۔

یہ تھیں اس گھر کی خصوصیات جسے تمام نوعِ انسان کے لئے مرکز قرار دیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ خصوصیات مٹی اور پتھر کے کسی مقام یا گھر کی نہیں۔ یہ خصوصیات اس نظام کی ہیں جس کا مرکز یہ گھر قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح (مثلاً) ہم کہتے ہیں کہ ماسکو کی پالیسی یہ ہے اور واشنگٹن نے یہ طے کیا ہے تو اس سے مراد ماسکو اور واشنگٹن کے شہر نہیں ہوتے۔ اس سے مراد وہ مملکتیں ہوتی ہیں جن کے یہ شہر مراکز ہیں۔

اسی طرح "کعبہ" سے مراد وہ نظامِ خداوندی، وہ قرآنی مملکت ہے، جس کا یہ مرکزی مقام ہے۔

———(۲)———

حضرت ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں اس مرکز کی تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد آپ، صدیوں پر پھیلے ہوئے تاریخ کے اوراق کو الٹ کر، چھٹی صدی عیسوی میں آجایئے جہاں وہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہوا جس کا مرکز کعبہ تھا۔ اس نظام کے قیام کے لئے سب سے پہلے ایک اُمّت تشکیل کی گئی جو رنگ، نسل، خون، وطن کے امتیازات کو مٹا کر خالص ایمان کی بنیادوں پر وجود میں آئی تھی۔ اس اُمّت کے وجود کا مقصد کیا تھا، اسے قرآن نے ان چند الفاظ میں نہایت جامعیت سے بیان کردیا جب کہا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ...... (۳/۱۰۹)" تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسان کے لئے پیدا

کیا گیا ہے"۔ غور کیجئے! جس طرح کعبہ کا مقصد نوعِ انسان کی فلاح و بہبود تھا اُسی طرح اس اُمّت کی بعثت کا مقصد بھی پوری کی پوری انسانیت (لِلنّاس) کی خیر طلبی تھا۔ اِس مقصد کے حصول کے لئے اس اُمّت نے ایک نظام قائم کیا۔ اس نظام کی رُو سے اس اُمّت کا فریضہ یہ قرار دیا گیا کہ

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط ۵ (۲/۱۴۳)

اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی اُمّت بنایا جو تمام نوعِ انسانی سے یکساں فاصلے پر رہے۔ نہ کسی کی طرف یونہی جھکی ہوئی، نہ کسی سے یونہی کھنچی ہوئی۔ فریضہ تمہارا یہ ہے کہ تم نوعِ انسانی پر نگاہ رکھو کہ اس کا قدم غلط سمت کی طرف نہ اُٹھنے پائے۔ اور تم پر تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (رسُول) نگاہ رکھے کہ تم غلط راستہ اختیار نہ کر لو۔

یہاں پھر "شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ" کہا گیا ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسان پر نگران۔ اِن خصوصیات کی حامل اُمّت کو "ملّتِ ابراہیمیؑ" (۲۲/۷۸) کی پیروکار کہہ کر پکارا گیا، یعنی حضرت ابراہیمؑ کی روش پر چلنے والی اُمّت۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا گیا تھا: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط (۲/۱۲۴) "نوعِ انسان کی امامت LEADERSHIP تمہارے سپرد کی جاتی ہے"۔ اور اسی بنا پر اس اُمّت سے کہا: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ط ..... (۲/۱۲۵) "تم منصب و مقامِ ابراہیمؑ کے حصول کو اپنی تگ و تاز کی جولاں نگاہ بناؤ"۔ یعنی جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو نوعِ انسان کی امامت کا سزاوار قرار دیا گیا تھا اسی طرح تم بھی اس نظام کے قیام سے، جس کا مرکز کعبہ ہے، عالم گیر انسانیت کی لیڈر شپ حاصل کرو۔

اِس اُمّت نے جو نظام قائم کیا تھا، اس کی بنیاد باہمی مشاورت پر تھی۔ (۴۲/۳۸)۔ اِس مشاورت کی روزہ مرّہ کی شکل تو صلوٰۃ کے اجتماعات تھے ——— آپ غور کیجئے کہ مشاورت کا حکم اور اقامتِ صلوٰۃ کا حکم ایک ہی سانس میں دیا گیا ہے (۴۲/۳۸)۔ لیکن پوری مملکت کے مسائل کے لئے مشاورت کے اجتماعات اِس سے کہیں زیادہ وسیع (بلکہ عالمگیر) پیمانے پر ہونے ضروری تھے۔ اُمّت کے اس عالمگیر اجتماع کو حج کہہ کر پکارا گیا ——— اس کے علاوہ نسبتاً چھوٹے پیمانے پر جو اجتماعات منعقد کئے جانے ضروری تھے انہیں عمرہ کہا گیا۔ اس اجتماعِ عظیم کا آغاز بھی حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا جب انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ... (۲۲/۲۷) "تم اعلان کر دو، تمام انسانوں کو دعوت دو کہ وہ حج کے اجتماع میں شرکت کے لئے آئیں"۔ اس اُسوۂ ابراہیمیؑ کے اتباع میں اِس اُمّت پر بھی یہ فریضہ عائد ہو گیا کہ وہ اِن اجتماعات کے انعقاد کا اہتمام کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتماعات اصلاً تو اُمّت کی باہمی مشاورت کے لئے ہوں گے، لیکن ان میں شرکت کے لئے تمام انسانوں (النّاس) کو دعوت دی گئی ہے۔ یہ بحیثیت مبصّر شریک ہوں گے۔ اِس سے مقصد کیا ہے، اس کے متعلق ہم آگے چل کر وضاحت کریں گے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا تھا

حج

کہ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ ..... (۲۲/۲۷) "حج کے لئے تمام لوگوں کو دعوت دو"۔ اسی طرح امتِ مسلمہ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے حج کے متعلق بھی کہا کہ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا ..... (۳/۹۶) "جو لوگ بھی (اَلنَّاسِ) وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں، انہیں چاہیئے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے (لِلّٰہ) حج کے اجتماع میں شرکت کریں"۔ آپ غور کیجئے کہ یہاں بھی النَّاس کہا ہے، اسے مؤمنین (مسلمانوں) تک محدود نہیں رکھا گیا۔

عربوں کے ہاں حج کا اجتماع زمانہ قبل از اسلام میں بھی ہوتا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت ابراہیمؑ تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہوئے ہیں تو ان سے کہا گیا تھا کہ حج کے اجتماع کا اہتمام کریں اور لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دیں۔ لیکن جس طرح، جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے بلند و بالا پروگرام کے عملی اجزاء بے معنی رسومات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح عربوں میں حج کے اجتماع نے بھی (کم و بیش) ایک میلہ کی شکل اختیار کر رکھی تھی، اور حجِ ابراہیمیؑ کے مناسک اور شعائر، مشرکانہ اور فاسقانہ (بلکہ جاہلانہ) رسوم بن کر رہ گئے تھے۔ بایں ہمہ اسے اہمیت بڑی حاصل تھی۔ اس اعتبار سے، تمام عربوں کی عمرانی زندگی کا مرکز تھا، اور قریش کو اس کی تولیت کی وجہ سے خاص امتیازی پوزیشن حاصل تھی۔ مادہ کے اعتبار سے اس لفظ (حج) کے معنی قصد و ارادہ کے بھی ہیں اور روک دینے کے بھی۔ زمانہ قبل از اسلام میں حج کے اجتماع میں، علاوہ دیگر امور، قبائل کے باہمی جھگڑے نپٹائے جاتے تھے اور زیادتی کرنے والوں کو ان کی دراز دستیوں سے روکا جاتا تھا۔ لیکن یہ روکنا تلوار کے ذریعے نہیں ہوتا تھا، دلائل و براہین کی رُو سے ہوتا تھا۔ یہیں سے لفظ حجت ہے جس کے معنی "دلیل" کے ہیں۔ اسی جہت سے قرآنی دلائل کو اَلْحُجَّۃُ الْبَالِغَۃُ ..... (۶/۱۴۹) کہا گیا ہے۔ اس لفظ کے ان بنیادی معانی اور تصورات سے اس اجتماع کا مقصد سامنے آجاتا ہے۔ یعنی دلائل و براہین پر مبنی مشاورت سے مملکت کے معاملات کا حل تلاش کرنا، اور غلط کاروں کو ان کے اقدامات سے روکنے کی تدابیر سوچنا۔

قرآن کریم نے عربوں کے اس اجتماع کو نہ صرف باقی رکھا، بلکہ اسے دین کے نظام میں ایک بنیادی ستون قرار دیا۔ فتحِ مکہ سے پہلے (۸ھ تک) کعبہ (کفار) قریش کی تحویل میں تھا اس لئے وہاں قرآنی انداز کے اجتماع (حج) کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فتحِ مکہ کے بعد، ۸ھ کا حج تو کم و بیش سابقہ روش پر ادا ہوا۔ لیکن ۹ھ میں اسے قرآنی شکل دے دی گئی۔ اس میں حضورؐ خود تو تشریف نہیں لے گئے، لیکن حضرت ابوبکرؓ صدیق کو نمائندہ مملکتِ قرآنیہ

حجِ اسلام

ط ایسا نظر آتا ہے کہ یہ مکان حضرت ابراہیمؑ سے بھی پہلے (کسی زمانے میں) تعمیر ہوا تھا لیکن بعد میں یہ، مرورِ زمانہ سے کھنڈر بن گیا اور اس کی صرف بنیادوں کے نشانات باقی رہ گئے تھے جن پر حضرت ابراہیمؑ نے دیواریں کھڑی کی تھیں۔ (۲/۱۲۷)۔

کی حیثیت سے، قافلۂ حجاج کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ اس اجتماع میں کم و بیش تمام سابقہ رسوم و مناسک کو برقرار رکھا، لیکن انہیں مشرکانہ اور جاہلانہ آمیزشوں سے پاک اور صاف کر گئے۔ اس سے پہلے حج کی سب سے بڑی خصوصیت وہ اعلانِ عظیم تھا جو مدینہ کی اسلامی مملکت کی طرف سے، غیر مسلموں (بالخصوص قریش) کے ساتھ تعلقات کا منشور تھا اور جو سورۂ توبہ میں مذکور ہے۔ سنہ ۱۰ھ میں یہ اجتماع خود ذاتِ رسالتمآبؐ کے زیرِ لوا منعقد ہوا اور اس میں حضورؐ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو عالمگیر انسانیت کے لئے صحیفۂ آزادی قرار پاتا ہے۔ اس کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ انسانوں کے خود ساختہ، رنگ، نسل، خون، زبان، وطن۔ قومیت۔ ذات پات۔ برادری۔ قبائل، ہر قسم کے امتیازات کو مٹا کر، خالص ایمان کی بنیادوں پر، انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی یہ اجتماع، انہی مقاصدِ عالیہ کے حصول کا ذریعہ تھا جنہیں قرآن نے متعین فرمایا تھا۔ اس میں وسیع و عریض مملکتِ اسلامیہ کے نمائندگان شریک ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ اُن لوگوں کو بھی خصوصی دعوت دی جاتی تھی جنہیں ارکان و عمالِ حکومت کے خلاف کسی قسم کی شکایت ہوتی۔ چونکہ یہ اجتماع مملکت کے دور دراز علاقوں سے آنے والوں پر مشتمل ہوتا تھا، اس لئے میدانِ عرفات میں ان کا باہمی تعارف ہوتا تھا۔ اسی جہت سے اسے عرفات کہتے تھے۔ (یعنی باہمی تعارف کی تقریب) سربراہِ مملکت یا اس کا نمائندہ اپنے خطاب میں اس پروگرام کا اعلان کرتا جو آئندہ سال کے لئے تجویز ہوتا تھا۔ اس کے بعد، یہ نمائندگانِ مملکت، منیٰ کے میدان میں جمع ہوتے، وہاں اور تین دن تک قیام کر کے اس پروگرام کی تفصیلات پر غور و خوض کرتے۔ مملکت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا جاتا۔ مستغیثین کی شکایات کا ازالہ کیا جاتا۔ اور یہ سب کچھ دلائل و حجت کی رُو سے کیا جاتا، دھاندلی اور سینہ زوری سے نہیں۔ ان فیصلوں اور تجویزوں کو ساتھ لے کر، یہ نمائندگان، اپنے اپنے مقامات کی طرف واپس جاتے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مکہ، اس وادی میں واقع ہے جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ (۱۴/۳۷) اس علاقہ میں اگر لاکھوں انسانوں کا اجتماع ہو تو سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ ان کے کھانے پینے کا کیا

قربانی؟

انتظام ہوگا؟ قرآن کریم اس قسم کے اہم سوال کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ اس اجتماع میں شرکت کرنے والے اپنی "خوراک" اپنے ساتھ آپ لائیں۔ سادہ ظاہر ہے کہ گوشت سے بہتر خوراک کونسی ہو سکتی تھی؟ اس نے کہا کہ یہ آنے والے کچھ جانور اونٹ اپنے ساتھ لائیں۔ آتے وقت ان پر بے شک سامانِ تجارت وغیرہ لاد لیں، اور یہاں پہنچ کر انہیں ذبح کریں۔ اُن کا گوشت خود بھی کھائیں، اور مکہ کے اُن غرباء کو بھی کھلائیں جنہیں عام حالات میں گوشت نصیب نہیں ہوتا۔ سورۂ حج کی آیات (۲۲/۲۸ ; ۲۲/۳۳ ; ۲۲/۳۶) میں یہ تمام تفصیل درج ہے۔ ان کے لئے "قربانی" کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ (نہ ہی ان جانوروں کے متعلق جنہیں بقرعید پر، قربانی کہہ کر ذبح کیا جاتا ہے)۔

(٠)

اِس کے بعد حج کے اُس بنیادی مقصد کی طرف آیئے جس کی تشریح کو ہم نے قصداً اس مقام کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ پہلے تمہیداً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دین کے مقاصد محض نظری تصورات یا ذہنی عقائد نہیں ہوتے، وہ محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں اور دین کے دعاوی کا ایسا عملی ثبوت بنتے ہیں جس سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ حج کے سلسلے میں بھی قرآنِ کریم نے اس کا اسی قسم کا مقصد بتایا ہے۔ سورۂ حج میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا:۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۙ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ..... ۝ (۲۲/۲۷-۲۸)

تم لوگوں میں اعلان کر دو کہ وہ حج کے لئے یہاں آیا کریں ——— دنیا کے دور دراز گوشوں سے لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے، پا پیادہ یا ایسی سواریوں پر جو سفر کی مشقت سے تھک کر چُور ہو جائیں۔

وہ یہاں اس لئے آئیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کی (یعنی نوعِ انسان کی) منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

نوعِ انسان کی منفعت

اِس میں "لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ" ..... کے الفاظ بڑے گہرے غور و تدبّر کے متقاضی ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ لوگ آئیں اور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدہ اس چیز کا ہو سکتا ہے جو محسوس طور پر سامنے آ جائے۔ یہ دعوت "النّاس" کو دی جاتی تھی جس میں اُمّتِ مسلمہ بھی شامل ہے اور غیر مسلم بھی۔ اِس اُمّت کے افراد یہ دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے اور غیر مسلم بھی اس کا مشاہدہ کر لیں کہ یہ نظام عالمگیر انسانیت کے لئے کس قدر منفعت بخش ہے۔ یہ نفع سامانیاں بھی ان کے سامنے محسوس شکل میں آئیں گی۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے حسنِ عمل۔ کارِ خیر۔ "ثواب" کے کاموں کے پرکھنے کا ایک ہی معیار بتایا ہے۔ اور وہ یہ کہ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ ط ..... (۱۳/۱۷) "دنیا میں بقا اسی عمل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان (النّاس) کے لئے نفس بخش ہو"۔ دین اور اس کے لئے ارکان و شعائر کی علّتِ غائی یہ ہے کہ ان سے ایسے نتائج مرتب ہوں جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت کا موجب ہوں۔ حج کے اجتماع میں ان منفعت بخش نتائج کو سامنے لایا جاتا تھا، اور اسی کے لئے تمام انسانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ .....

قرآنی نظامِ مملکت میں غیر مسلموں کو شریکِ حکومت تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن بعض فنّی اور ٹیکنیکی معاملات میں اُن سے مشورہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ ایسا کیا کرتے تھے، اور اس زمانے میں غیر مسلم مکّے میں آیا جایا کرتے تھے۔ (کتاب الخراج، امام یوسفؒ۔ بحوالہ شبلی نعمانیؒ) غیر مسلموں کو حج کے اجتماع میں مُبصّر کی حیثیت سے شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کی بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

لیکن اس کے لئے ایک شرط ضروری ہے، اور وہ یہ کہ اس میں کوئی شخص کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جو ان مقاصد کے خلاف جائے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے۔ ایسا کرنے کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۲۲/۳۰)۔ اسی بنا پر مشرکینِ مکہ کو اس میں شرکت سے روک دیا گیا تھا۔ (۹/۲۸)۔

بہرحال مقصد اس اجتماع سے یہ تھا کہ نوعِ انسان کو بتایا اور دکھایا جائے کہ قرآنی نظام ان کی منفعت اور بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

(۰)

ہمارا حج

یہ تھا اجتماعِ حج کا مقصد۔ اُس زمانے میں دین اپنی اصلی شکل میں موجود تھا، لیکن جب وہ مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس کے مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ مذہب کرتا یہ ہے کہ دین کی روح (مقصد اور غایت) کو فنا کر دیتا ہے لیکن اس کے شعائر اور مناسک کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھتا ہے، اور ان کی رسمی پابندی پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس سے قوم اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ احکامِ خداوندی کا اتباع ہو رہا ہے۔ اس سے انہیں ایک عقیدتمندانہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جو اُن کے اپنے ہی دل کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر عوام ان رسوم و مناسک کی انتہائی جذب و عقیدت سے پابندی کئے جاتے ہیں، یہ دیکھے بغیر کہ ان کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ اسی میں مذہب کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ لوگ اگر سوچنے لگ جائیں تو مذہب کے مفاد و مقاصد ختم ہو جاتے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ موجودہ حج پر نگاہ ڈالیں اور سوچیں کہ کیا اس سے وہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں جن کے لئے اس کا انعقاد ضروری قرار دیا گیا تھا۔ بات یہاں سے چلی تھی کہ وحی کی غایت اور انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ رنگ، نسل، زبان، خون، وطن اور قومیت کے اختلافات کو مٹا کر (جن کی وجہ سے نوعِ انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے) اُسے پھر سے ایک عالم گیر برادری کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ اس کے لئے ایک نظام تجویز ہوا تھا جس کا مرکز کعبہ تھا، اور جس کے اجتماع کا نام حج تھا۔ حج کا اجتماع اب بھی ہوتا ہے، اور پہلے سے کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ وسیع تر پیمانے پر۔ ایک ایک اجتماع میں پندرہ پندرہ، بیس بیس لاکھ حاجی شریک ہوتے ہیں۔ چالیس، پچاس ہزار کا انبوہِ عظیم تو صرف پاکستان سے اس میں شرکت کے لئے جاتا ہے۔ حکومت کا ایک پورا محکمہ اس کے انتظامات کے لئے وقف ہے۔ وہ سال بھر اسی میں مصروف رہتا ہے۔ ان چالیس، پچاس ہزار حاجیوں کے لئے (مملکت کا انتہائی مشکلوں سے حاصل کردہ) زرِ مبادلہ جس قدر صرف ہوتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ یہ حاجی، شدت کی گرمی اور دیگر ناسازگار حالات میں سفر کی صعوبات برداشت کرتے ہیں۔ ان میں مہینوں لگ جاتے ہیں جن میں وہ کوئی اور کام ہی نہیں کر پاتے۔

وقت، توانائی، روپیہ کے اس صرف اور اس قدر جانکاہ مشقتوں کا حاصل کیا ہوتا ہے؟ ان افراد کا جذباتی اطمینان کہ ہم نے ایک فریضہ ادا کر لیا ہے۔ محض افراد کا جذباتی اطمینان تو کوئی ایسی خصوصیت

نہیں جس کی بنا پر اسلام کو ایک منفرد نظامِ حیات قرار دیا جا سکے! اس قسم کا اطمینان تو تمام اہلِ مذاہب اپنے اپنے طور پر حاصل کر سکتے اور کر لیتے ہیں!

علاوہ ازیں دنیا کے تمام مسلمان اسی طرح مختلف قوموں اور وطنوں میں منقسم ہیں جس طرح غیر مسلم۔ ان ممالک اور اقوام کے افراد حج کے اجتماع میں بھی اپنے اپنے وطنی اور قومی تشخص کو برقرار رکھتے ہیں۔ مذہبی تفریق اس پر مستزاد ہے۔ اس کی شدت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ چند سال ادھر کی بات ہے کہ پاکستان کے ایک بہت بڑے مذہبی رہنما نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ ہم تو حرمِ کعبہ میں بھی، امامِ کعبہ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے ——— اپنی جماعت الگ کرتے ہیں۔

یہ ہے کیفیت ہمارے اس اجتماع کی جس کا مقصد وطنوں اور قومیتوں کے امتیازات کو مٹا کر تمام نوعِ انسان کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا۔ دین جب اپنی اصلی شکل میں موجود تھا تو مسلمانوں کا (حج تو ایک طرف) نمازوں تک میں اجتماع مخالفین کے دلوں میں دھڑکن پیدا کر دیا کرتا تھا اب کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں کے قریب ایک ارب آبادی کے بحرِ ذخار میں اسرائیل مملکت کی حیثیت خس و خاشاک سے زیادہ نہیں۔ گذشتہ پچیس تیس سال سے لاکھوں کا یہ اجتماع عرفات کے میدان میں رو رو کر خدا سے فریاد کرتا چلا آ رہا ہے کہ غاصب اور مغضوب علیہ اسرائیل کا بیڑا غرق ہو، اور اسرائیل ہے کہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ہے "مذہب کے حج" کا نتیجہ۔ الدین کا حج ہوتا تو اس کے صرف اعلان پر دنیا کی بڑی سے بڑی غلط کوش قوم کپکپانے لگ جاتی! اب یہ اُمت غیر مسلموں کی چھوٹی سی چھوٹی قوموں سے ڈرتی اور کانپتی ہے۔ حج کے عظیم اجتماع میں خالی دعائیں مانگ کر چلی آتی ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دے لیتی ہے کہ یہودی "مغضوب علیہ" قوم ہیں اس لئے یہ تباہ ہو کر رہیں گے۔ کمزور انسان اپنے مخالف کو گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے ہیں۔

اُمت کی یہ حالت ہے اور اس کے مذہبی پیشوا اس پر مسلسل زور دیئے جاتے ہیں کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ارکانِ اسلام کی رسمی طور پر پابندی کرتے رہیں اور ان کی غرض و غایت اور مقصود و مطلوب کے متعلق کچھ نہ سوچیں۔ اسی میں ہماری مختلف مملکتیں بھی اپنا اپنا مفاد مضمر دیکھتی ہیں اور مذہبی پیشوائیت کے فروغ کا سامان بہم پہنچا کر انہیں تاکید کرتی ہیں کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے — پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اسی کے پیشِ نظر، ابلیس نے اپنے مشیروں سے کہا تھا: ؎

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج — صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا — کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام!

(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ - ارمغانِ حجاز)

ابلیس کا یہ سحر اس وقت ٹوٹے گا جب یہ قوم کتاب اللہ کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنائیگی۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کا یہ اٹل فیصلہ کارفرما ہو کر رہے گا کہ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۝ (۴۷/۳۸)۔

اگر یہ (قرآن سے اسی طرح) روگرداں رہے تو ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لیگی، اور وہ ان جیسی نہیں ہو گی۔

خدا کے وعدوں کی طرح اس کی وعیدیں بھی اٹل ہوتی ہیں! لیکن اس استبدالِ قومی میں جو تباہی آتی ہے، وہ بڑی قیامت خیز ہوتی ہے۔ والسلام

پرویز

(۰)

کچھ قرآنک کالج کے متعلق

(چوہدری محمد حسین۔ سیکرٹری احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی لمیٹڈ)

طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۷۹ء میں، سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ (گرامی قدر شیخ سراج الحق، جنہیں مرحوم لکھتے وقت جگر شق ہو جاتا ہے) نے قرآنک ریسرچ سنٹر اور کالج کی سکیم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد بتایا تھا کہ ان مقاصد کے لئے حصولِ اراضی کی جدّوجہد کن صبر آزما مراحل سے گذر کر اس مقام پر پہنچ گئی تھی، جہاں (انہوں نے کہا تھا کہ) "اب ہم خدا کے فضل سے اس قابل ہیں کہ عمارات کی تعمیر کے لئے قدم اٹھایا جائے۔" اس امکان کی روشنی میں محترم پرویز صاحب نے احباب سے عطیات کی اپیل کی تھی، جس کا انہوں نے نہایت کشادہ ظرفی اور خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ اس کے بعد، طلوعِ اسلام میں، معطیان کی فہرستیں تو شائع ہوتی رہیں لیکن اس سکیم کی پیش رفت کے متعلق کوئی وضاحت سامنے نہ آئی۔ اس قدر طویل عرصہ کی خاموشی کی وجہ سے احباب کا وقفِ تشویش ہو جانا فطری امر تھا۔ چنانچہ ان کی طرف سے استفسارات موصول ہوتے رہے، یہ سطور ان کی شدّتِ انتظار میں تخفیف کے لئے سپردِ قلم کی جا رہی ہیں۔

اس سکیم کے لئے حصولِ اراضی کے سلسلے میں ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔ سکیم کی اصل و اساس تو قرآنک ریسرچ سینٹر اور درسگاہ کا قیام تھا لیکن بعض مصالح کے پیشِ نظر ان سے ملحق ایک مختصر سی بستی بسانے کی تجویز بھی۔ اس سے منسلک تھی، حکومت نے ان مقاصد کو قابلِ قبول قرار دیتے ہوئے قریب (۱۸۴) کنال زمین اصل مالکان سے حاصل (ACQUIRE) کر کے قریب چار لاکھ روپے کے عوض، سوسائٹی کو دے دی۔ یہ رقبہ ان ہر دو سکیموں کے لئے تھا، لیکن قانونی تقاضا کے پیشِ نظر حکومت نے اس کا معاہدہ احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے ساتھ کیا۔ اس بنا پر، اس اراضی کے سلسلے میں مزید کارروائی کی ذمہ داری اسی سوسائٹی پر عائد ہوتی تھی۔ احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی اور قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کی مشاورت سے طے پایا کہ اس رقبہ میں سے جو اسی کنال اراضی قرآنک سوسائٹی کی طرف منتقل کر دی جائے گی اور بقایا اراضی، احباب ہاؤسنگ سوسائٹی کے لئے مختص ہو گی۔ رقبات کی اس تقسیم کے بعد، قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی اپنی سکیم کو خود، آزادانہ، بروئے کار لائے گی اور احباب سوسائٹی اس میں کسی طور بھی دخیل نہیں ہو گی۔

حصولِ اراضی کی جدّوجہد جن صبر آزما مراحل سے گذری تھی، اس کا تذکرہ سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

نے اپنے مذکورہ بالا بیان میں کر دیا تھا۔ ان مراحل کے طے ہو جانے کے بعد، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۸ء میں جملہ اراضی کا قبضہ باقاعدہ احباب کو اپر مڈل ہاؤسنگ سوسائٹی کو مل گیا تھا۔ کلکٹر حصولِ اراضی نے سوسائٹی کو قبضہ دیتے وقت متعلقہ اہل کارانِ استعمالِ اراضی کو تحریری طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ "تبدیلیٔ قبضہ و حقوقِ ملکیت کے بارے میں کارروائی کا اندراج روزنامچہ واقعاتی میں کر کے کاغذات مال میں عملدرآمد کریں"۔

اگلا مرحلہ، اس اراضی کو لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی سے ان کی سکیموں سے مستثنیٰ قرار دینے کی منظوری حاصل کرنا تھا۔ اس کے لئے انہیں ۷ نومبر ۱۹۷۸ء کو درخواست دی گئی۔

انہوں نے ۹-۷-۱۹۷۹ کو ہمیں مطلع کیا کہ انہوں نے ہماری درخواست منظور کر لی ہے اور کہا کہ انہیں ہاؤسنگ سوسائٹی کے نقشہ جات (DETAILED LAYOUT PLANS) مہیا کئے جائیں۔ انہیں یہ نقشے مہیا کئے گئے تو انہوں نے جولائی ۱۹۸۰ء کو کہا کہ زمین کی ملکیت کے جو کاغذات ہم نے انہیں مہیا کئے تھے، وہ ان کے لئے کافی نہیں۔ انہیں پٹواری وغیرہ کی طرف سے تیار کردہ دستاویزاتِ ملکیت مہیا کی جائیں۔ یہاں سے معاملہ محکمہ مال کے اہل کاروں کی طرف منتقل ہو گیا۔ ہم نے سمجھا تھا کہ قبضۂ اراضی کے جو کاغذات افسرانِ بالا نے ۱۹۷۸ء میں ہمیں دیئے تھے اور انہوں نے محکمہ مال کے عملے کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے کاغذات میں ضروری کارروائی کر لیں، اس کے پیشِ نظر ان سے متعلقہ نقول حاصل کرنے میں نہ کوئی دقت ہو گی، نہ زیادہ وقت لگے گا۔ لیکن کافی تگ و تاز کے بعد معلوم ہوا کہ حکامِ بالا نے متعلقہ اہل کاروں کو جو حکم ۱۹۷۸ء میں دیا تھا، وہ ہنوز منتظرِ تعمیل ہے۔ اس کے مطابق عمل درآمد کرانے کے لئے ہم گذشتہ ایک سال سے مصروفِ تگ و تاز رہے اور اب جا کر ایسا نظر آتا ہے کہ اس میں مزید تاخیر نہیں ہو گی۔

ہم چاہتے تھے کہ معاملہ کسی یقینی مرحلہ تک پہنچ جائے تو احباب کو صورتِ حالات سے مطلع کیا جائے۔ ان دستاویزات کے مکمل ہو جانے کے بعد، ایل۔ ڈی۔ اے سے پلان منظور کرانے کے لئے چارہ جوئی کی جائے گی۔ چونکہ اس ماہ کے طلوعِ اسلام کے پریس میں جانے کا وقت ہو گیا ہے، اس لئے اس اس باب میں زیادہ انتظار نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد اگر کوئی پیش رفت ہوئی یا کوئی لائحہ عمل پیش آئی تو اس سے آئندہ ماہ کے طلوعِ اسلام میں احباب کو مطلع کیا جائے گا۔ احباب سے میری مراد احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کے اراکین بھی ہیں اور وہ ہزاروں رفقاء بھی جو قرآنک سینٹر اور قرآنک کالج کی سکیم سے قلبی وابستگی رکھتے ہیں۔

اس سکیم کی تکمیل میں تاخیر سے ہمارے اور آپ کے دلوں پر جو گذر رہی ہے، وہ تو گذر رہی ہے لیکن اس سے مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کے دل پر جو بیت رہی ہے اس کا

اندازہ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ صاحبِ ضبط، اس کا اظہار ہم سے بھی نہیں کرتے۔ ہماری تنگ و دو کے ہر موڑ پر، صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ "میری زندگی کے دن گنتی کے ہیں ان سے فائدہ اٹھا لو"۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو اس سے ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا لیکن ہم، ہماری قوم، بلکہ آنے والی نسلوں تک جس فیضان سے محروم رہ جائیں گی، اس کی کمی کو کوئی بھی پورا نہیں کر سکے گا۔ اور یہی وہ احساس ہے، جس کی وجہ سے ہم اپنی تگ و تاز میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ والسلام

(۰)

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ)

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ایک آزاد تنظیم ہے جس کا ملک کی کسی تنظیم، کسی ادارہ، کسی مذہبی فرقہ یا سیاسی پارٹی، حتیٰ کہ ادارہ طلوعِ اسلام سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ اس کے اپنے قواعد و ضوابط ہیں۔ احباب کو اپر ٹیو سوسائٹی سے بھی اس کا اتنا ہی تعلق ہے کہ سردست ان دونوں کا رقبۂ اراضی مشترک ہے۔ رقبات کی تقسیم کے بعد اس کے ساتھ یہ تعلق بھی ختم ہو جائے گا۔ اراضی کی قیمت حکومت کو ادا کی جا چکی ہے۔

(۲) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے لئے جو عطیات موصول ہوتے ہیں، ان کی باقاعدہ رسید کاٹی جاتی، اور معطی کو ارسال کی جاتی ہے۔ پھر ان عطیات کی فہرست مجلّہ طلوعِ اسلام میں شائع کی جاتی ہے تاکہ معطیان اسے چیک کر لیں۔ حبیب بینک، مین مارکیٹ برانچ، گلبرگ نمبر ۲ لاہور میں اس کا اکونٹ ہے، اور اس کے حسابات ہر سال، مستند آڈیٹرز سے آڈٹ کرائے جاتے ہیں۔ انتظامی معاملات سوسائٹی کی مجلسِ منتظمہ، (ایگزیکٹو کمیٹی) میں طے ہوتے ہیں۔ اس کے عہدیداران یا مجلسِ منتظمہ کے اراکین کوئی تنخواہ نہیں لیتے۔

(۳) جیسا کہ متعدد بار اعلان کیا جا چکا ہے، سوسائٹی کے عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

(۴) یہ معلومات جملہ معطیان کی اطلاع کے لئے پیشِ خدمت ہیں جن کے عطیات کے ہم امین اور مسئول ہیں۔

(۵) مذکورہ بالا وضاحت کے ساتھ یہ بھی گذارش ہے کہ آئندہ ترسیلِ عطیات برائے قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی و رقوم برائے ادارہ طلوعِ اسلام کے چیک اور ڈرافٹ۔ منی آڈرز وغیرہ علیحدہ علیحدہ بھیجے جائیں، انہیں مخلوط کر کے نہ ارسال کیا جائے۔

مرزا محمد خلیل

(خازن۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی)

(۰)

فہرست معطیانِ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

(۲۰ مئی تا ۱۹ جولائی ۱۹۸۱ء)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم	روپے	
۱- ڈاکٹر رشید ارشد صاحب - مریدکے	۲۰۰/-	۳۹۲۱
۲- میاں عابد صاحب ٹرانسوال - جنوبی افریقہ	۱۱۷/-	۳۹۲۲
۳- فیاض رضوی صاحب، مڈل سیکس معرفت بزم طلوعِ اسلام لندن	۱۰۱۳/۷۰	۳۹۲۳
۴- مقبول محمود فرحت صاحب لندن " " " "	۱۰۱/۵۰	۳۹۲۴
۵- محترمہ مسز جعفر عباس، ویمبلے مڈل سیکس " " "	۱۰۱/۵۰	۳۹۲۵
۶- مسز ناہید قریشی بذریعہ حبیب خان صاحب لندن " " "	۵۰۷/۳۰	۳۹۲۶
۷- عبد الغفور محسن صاحب، معرفت بزم طلوعِ اسلام کوئٹہ	۵۰۰/-	۳۹۲۷
۸- ملک حنیف وجدانی صاحب - مری	۵۰/-	۳۹۲۸
۹- محترمہ مسز زبیدہ مشرف - اسلام آباد	۱۰۰/-	۳۹۲۹
۱۰- بیگم چوہدری عبد الکریم نظامی ننکانہ صاحب	۵۰/-	۳۹۳۰
۱۱- والدہ خرم شہزاد اشرف بی بی، معرفت صوبیدار یوسف علی، چک ۱۹۹ ج ب سمندری	۱۰۰/-	۳۹۳۱
۱۲- محمد عالم صاحب - دوحہ قطر	۲۰۰/-	۳۹۳۲
۱۳- محمد بشیر خان صاحب معرفت بزم طلوعِ اسلام لاہور	۲۰۰/-	۳۹۳۳
۱۴- محمد اسلم صاحب - گوجرہ	۲۰۰/-	۳۹۳۴
۱۵- محمد ارشاد صاحب ٹیچر، چارہان - مری	۲۵/-	۳۹۳۵
۱۶- ملک محمد سلیم صاحب ایڈووکیٹ، معرفت بزم طلوعِ اسلام راولپنڈی	۱۰۰/-	۳۹۳۶
۱۷- سید محمد امین صاحب " " "	۵۰/-	۳۹۳۷
۱۸- معرفت بزم طلوعِ اسلام لاہور	۲۵/-	۳۹۳۸
۱۹- محمد صدیق خان صاحب - ملتان چھاؤنی	۶۰۰/-	۳۹۳۹
۲۰- غلام عباس جعفر صاحب، ویمبلے مڈل سیکس معرفت بزم طلوعِ اسلام لندن	۹۸/-	۳۹۴۰
۲۱- یوسف علی صاحب، لندن بذریعہ حبیب خان صاحب " "	۹۸/-	۳۹۴۱
۲۲- میجر محمد حنیف صاحب (CLEVELAND) بذریعہ اشفاق احمد صاحب معرفت بزم طلوعِ اسلام لندن	۹۸/-	۳۹۴۲
۲۳- قربان علی صاحب " " " " "	۱۹۶/-	۳۹۴۳
۲۴- اشفاق احمد صاحب " " " " "	۵۸۸/۱۴	۳۹۴۴
۲۵- محمد حنیف کالو صاحب " " " "	۱۹۶/-	۳۹۴۵
۲۶- ظہور احمد صاحب " " " " "	۱۹۶/-	۳۹۴۶
۲۷- محمد یامین صاحب " " " " "	۹۸/-	۳۹۴۷
۲۸- محمد شتاق صاحب " " " " "	۹۸/-	۳۹۴۸
۲۹- مشتاق احمد صاحب " " " " "	۹۸/-	۳۹۴۹
۳۰- محترمہ مسز زبیدہ مشرف - اسلام آباد	۲۱۳/-	۳۹۵۰
۳۱- ڈاکٹر نثار احمد صاحب، ویسٹ جرمنی - معرفت رشید احمد بٹ صاحب - برطانیہ (UK)	۱۰۰۰/-	۳۹۵۱
۳۲- احباب کویت، معرفت محترم محمد عمر دراز خان، کویت	۳۰۰۰/-	۳۹۵۲
۳۳- مظفر علی سید صاحب - کراچی	۵۶/-	۳۹۵۳
۳۴- محترمہ بیگم چوہدری عبد الکریم نظامی، ننکانہ صاحب	۱۰۰/-	۳۹۵۴

میزان =	۱۰۳۷۴/۱۴
سابقہ میزان =	۷۰۱۸۹۷/۱۹
کل میزان =	۷۱۲۲۷۱/۳۳

ضروری تصحیح

فہرست عطیات مطبوعہ جون ۱۹۸۱ء - نمبر شمار ۲۰ میں ملک حبیب وجدانی کے بجائے "ملک حنیف وجدانی" ہونا چاہیے تھا۔ —— (ناظم ادارہ) ——

حقائق و عبر

۱۔ صدرِ مملکت نے فرمایا

اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیلِ جدید کی افتتاحی تقریب پر، صدر مملکتِ پاکستان نے اپنے خطاب کے دوران فرمایا:۔

یہ حقیقت ہے کہ میں نہ عوام کا منتخب کردہ نمائندہ ہوں، نہ ہی مجھے کسی نے مسندِ اقتدار پر فائز ہونے کے لئے چنا ہے۔ یہ بتوفیقِ ایزدی تھا کہ جون۔جولائی ۱۹۷۷ء میں، ملک میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے، ان کی وجہ سے مجھے اقتدار سنبھالنا پڑا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے میرے ذمے کچھ فرائض عائد کئے تھے، جنہیں میں، اور میرے رفقاء انشاء اللہ سرانجام دیتے رہیں گے۔ ان فرائض کی ادائیگی کے بعد، جب اسلامی اقدار کے مطابق نظام قائم ہو جائے گا، تو میں اقتدار ان لوگوں کی طرف منتقل کر دوں گا جو اس کے لئے موزوں ہوں گے۔ بہرحال جبتک خدا چاہے گا کہ ہم اپنے فرائض ادا کرتے رہیں، ہم ایسا کرتے رہیں گے۔

(ڈی مسلم۔ ۲۳ جون ۱۹۸۱ء۔ ص ۱)

(۰)

۲۔ ایک حدیث

ماہنامہ البلاغ (کراچی) کی جون ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں، جو (مولانا) محمد تقی عثمانی، جنہیں حال ہی میں وفاقی شرعی عدالت کا جج مقرر کیا گیا ہے، کے زیرِ ادارت شائع ہوتا ہے، حسبِ ذیل حدیث شائع ہوئی ہے:۔

اسی طرح صحیح بخاریؒ، غزوۃ الطائف میں، ایک حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک پانی کے برتن میں کلی کر کے حضرت ابو موسیٰؓ اور حضرت بلالؓ کو عطا فرمایا کہ اس کو پی لیں اور اپنے چہرے پر مل لیں۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ پردے کے پیچھے یہ واقعہ دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اندر سے آواز دے کر ان دونوں بزرگوں سے کہا کہ اس تبرک میں سے کچھ اپنی ماں یعنی ام سلمہؓ کے لئے چھوڑ دینا۔ (ص ۱۳)

(۰)

۳۔ نیشنلسٹ علماء کے دلائل

ہم سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران، جو نیشنلسٹ علماء مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کیا کرتے تھے، ان کے دلائل کس قسم کے ہوتے تھے؟ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن حال ہی میں ان کی ایک ایسی دلیل سامنے آئی ہے جس سے قارئین کو محروم رکھنا بخل ہوگا۔

ہفت روزہ چٹان کی (۲۲) جون ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں، محترم محمد یحییٰ خان (سابق وزیر تعلیم صوبہ سرحد) کا ایک خط چھپا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ جولائی یا اگست ۱۹۴۵ء کی بات ہے وہ شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ کی معیت میں، (سرینگر میں) مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی خدمت میں حاضر ہوئے، شیخ محمد عبداللہ نے مولانا صاحب سے کہا کہ "جنابِ والا، تقسیم کا سوال ہے اور مسلمان اس مسئلہ میں تلے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ تقسیم درست ہے اور دوسرا گروہ تقسیم کے خلاف ہے۔ اس میں براہِ خدا ہماری رہنمائی کریں کہ ہم کونسا راستہ اختیار کریں۔ ہم نہایت پریشان ہیں"۔

سوال آپ نے سن لیا۔ اب مولانا (مرحوم) کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ (واضح رہے کہ مولانا مرحوم، امام الہند کہلاتے تھے اور نیشنلسٹ علماء کے طائفہ کے سرخیل تھے)۔ انہوں نے فرمایا:-

> میں تقسیمِ ملک کے خلاف ہوں۔ اوّل وجہ مذہبی بناء پر ہے۔ اسلام ایک تبلیغی دین ہے۔ اور ہر مسلمان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام اور اللہ تعالیٰ کا پیغام ہر غیر مسلم تک پہنچائے اور اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا راستہ اس کو دکھائے۔ ہندوستان کی آبادی چالیس کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے جس میں دس کروڑ مسلمان اور تیس کروڑ غیر مسلم ہیں۔ ان دس کروڑ مسلمانوں میں سے ہر ایک مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا راستہ ان کو دکھائے۔ یہ ایک ایسا فرض ہے جس سے کوئی بھی مسلمان پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی اس فرض سے اس کی گلو خلاصی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور یہاں ہر مسلمان کے لئے اپنا فرض پورا کرنے ...... کا موقع ہے۔ تقسیم کے بعد مسلمان غیر مسلموں سے الگ ہو جائیں گے اور اس دینی فرض کو پورا کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ جو کہ ایک نہایت ہی بدبختی ہوگی۔ میں بحیثیت ایک مسلمان کے اس بدقسمتی کو دیدہ دانستہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

کوئی جاننے والا وہاں موجود ہوتا تو مولانا (مرحوم) سے پوچھتا کہ سرکار! حضور نبی اکرمؐ پورے کے پورے کفار کے گروہ کو مکہ میں چھوڑ کر، خود بھی وہاں سے ہجرت فرما گئے اور اپنے رفقاء (صحابہؓ) کو بھی ساتھ لے گئے، (تاکہ مدینہ میں آزاد اسلامی مملکت قائم کی جا سکے) اور قریش میں تبلیغِ اسلام کے لئے کسی کو بھی نہ چھوڑا۔ فرمائیے! حضورؐ کے اس فیصلہ اور اقدام کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟

مولانا (مرحوم) موجود ہوتے تو ہم ان سے یہ بھی پوچھتے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو تبلیغِ اسلام کے جس قدر مواقع حاصل ہیں، ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

یہ نمونہ ہے ان دلائل کا جن کی رُو سے یہ حضرات عوام کو ورغلایا کرتے تھے کہ تحریک پاکستان، اسلام کے خلاف ہے!

اس کے ساتھ ہی طنز کا ایک نشتر بھی ملاحظہ فرمائیے! مولانا (مرحوم) نے اُسی تسلسل میں فرمایا:-

میری مخالفت کی دوسری وجہ سیاسی ہے۔ یہ تقسیم، ہندوستان کو کمزور بنانے کے لئے کیا جارہا ہے۔ تقسیم سے ملک اور قوم دونوں مٹ جائیں گے۔ اور تقسیم شدہ دونوں حصّے کمزور ہو جائیں گے۔ چھوٹا حصّہ تو رہا ایک طرف، بڑا حصہ بھی موجودہ ہندوستان سے کمزور ہوگا۔ لیکن بات کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ یہ نہ آپ کے اختیار میں ہے اور نہ میرے بس میں۔ یہ فیصلہ کسی اور نے کیا ہے۔ اور اس قسم کے فیصلے وہ پہلے بھی کر چکا ہے۔ اور ہندوستان کے ٹکڑے بخرے پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ برما و سیلون پہلے ہی ہندوستان سے جُدا کئے گئے ہیں۔ میں ان وجوہات کی بناء پر ملک کے تقسیم کے خلاف ہوں۔

ہندو شروع سے کہا کرتے تھے کہ جناحؒ کی تقسیم ملک کی تجویز درحقیقت انگریز کی اسکیم ہے اور یہ (جناحؒ) انگریز کا آلہ کار ہے۔ اسی کی صدائے گونج مولانا (مرحوم) کی یہ دلیل تھی۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ان سے پوچھتے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جو چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ میں نے ہندوستان کو غیر منقسم رکھنے کے لئے آخری حد تک زور مارا لیکن مسٹر جناحؒ نے ہماری پیش نہ جانے دی، اور وہ اپنی بات منوا کر رہے، تو اس کا کیا جواب ہے؟

(مولانا) آزاد (مرحوم) کا معاملہ دراصل ذاتی سا ہو گیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے جو انہیں ..... ('SHOW BOY' OF CONGRESS) کہہ دیا تھا، تو اس چوٹ کی کسک ان کے دل سے آخر تک نہیں گئی، ورنہ ابوالکلام آزاد جیسا سیاستدان کم از کم اس قسم کی سوقیانہ بات نہ کہتا۔

(۰)

۴۔ مولانا نورانی اور (کالعدم) جماعتِ اسلامی

(مولانا) شاہ احمد نورانی نے، کراچی میں ایک پریس کانفرنس میں فرمایا:-

ہم نے اصولی طور پر طے کیا ہے کہ کالعدم جماعتِ اسلامی کو اپنے اتحاد میں شامل نہیں کریں گے کیونکہ یہ دہشت پسند تنظیم ہے۔ وہ تخریب کاروں کا ٹولہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ تحریک نظامِ مصطفےٰ میں (کالعدم) جماعتِ اسلامی سے ہم نے اتحاد اسلئے کیا تھا کہ ہم تخریب کاروں کا مقابلہ تخریب کاروں سے کرانا چاہتے تھے چونکہ (کالعدم) پیپلز پارٹی بھی تخریب کاروں کی جماعت تھی۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ کراچی۔ مورخہ ۲ جولائی ۱۹۸۱ء)

۵۔ ایران کا اسلامی نظام

کراچی کے روزنامہ جنگ میں، (مولانا) کوثر نیازی کا ایک کالم، بعنوان "مشاہدات و تاثرات" شائع ہوتا ہے۔ ۹ جولائی ۱۹۸۱ء کو شائع شدہ یہ کالم، ایران کے واقعات و حوادث پر مشتمل ہے۔ ہم اس کے چیدہ چیدہ اقتباسات درج ذیل کرتے ہیں:۔

(۱) بنی صدر کا تعارف

ایران کے سابق صدر، بنی صدر کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:۔

یہ جناب بنی صدر کون تھے؟ کوئی ملحد اور بے دین نہ تھے۔ ان کے والد جناب نصر اللہ بنی صدر خود آیت اللہ تھے اور اپنے وقت کے جید ایرانی علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا، باپ سے دینی علوم ورثہ میں لینے کے علاوہ جناب بنی صدر نے دنیوی علوم میں بھی دسترس حاصل کی تھی اور وہ ایران سے باہر بھی پائے کے ماہر معاشیات و اقتصادیات مانے جاتے تھے۔ جرمی اتنے کہ شہنشاہیت کے خلاف ایامِ طالب علمی سے سینہ سپر رہے اور اسی جرم میں سالوں جلاوطنی کی سزا بھگتی۔ بے غرض ایسے کہ شہنشاہ نے بڑے بڑے عہدوں کی لالچ دی۔ یہاں تک کہ اپنی بیٹی شہناز کا رشتہ پیش کیا مگر جناب بنی صدر کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ احسان کیش اور بامروت ایسے کہ حضرت آیت اللہ خمینی ۱۹۷۸ء میں عراق سے پیرس آئے تو جناب بنی صدر نے جان ہتھیلی پر رکھ کر انہیں اپنے گھر میں پناہ دی اور وہ جبتک وہاں رہے خود ان کی حفاظت کے لئے پہرہ دیتے رہے۔ مقبول اتنے کہ شہنشاہیت کا تختہ الٹنے کے بعد صدارتی انتخابات ہوئے تو وہ پچھتر فی صد ووٹ لے کر اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر منتخب ہوئے۔

اس کے بعد انہوں نے بتایا ہے کہ اس بنی صدر کے ساتھ ایران میں کیا ہوا؟ بنی صدر کی معزولی کے بعد ایران میں ان کے حق میں جو مظاہرے ہوئے، اس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:۔

جناب بنی صدر کی حمایت میں مظاہرے ہوئے تو انہیں سختی سے کچل دیا گیا۔ بیسیوں لوگوں کو پھانسی دے دی گئی۔ حد یہ ہے کہ بیس نوجوان لڑکیاں جن کی قیادت ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کر رہی تھی اور جن کی عمر نو سے سولہ سال تھی، اس جرم میں گولی کا نشانہ بنا دی گئیں کہ وہ جناب بنی صدر کی حمایت میں جلوس نکال رہی تھیں۔ آیت اللہ خلخالی کے بعد منصب قضا اب آیت اللہ محمدی گیلانی صاحب کے سپرد ہے۔ یہ قسمت کی ماریاں انہیں کے حضور پیش ہوئیں۔ قاضی صاحب نے پوچھا تمہارا نام، ہر لڑکی نے جواب دیا "مجاہدہ"، پوچھا، کس کی بیٹی ہو، ہر ایک نے کہا، "ایرانی عوام کی"، جب اس طرح شناخت ممکن نہ رہی تو آیت اللہ صاحب نے حکم

دیا ان کے فوٹو لے لئے جائیں۔

آیت اللہ محمدی گیلانی یہ عظیم کارنامہ انجام دینے کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب کرنے تشریف لے گئے۔ کسی نے پوچھا۔ مرنے والی بچیوں میں بعض کی عمر نو سال کی تھی ان پر تو رحم کرنا چاہیئے تھا۔ فرمایا، اسلامی اصول کے تحت نو سال کی عمر سمجھ اور شعور کی عمر ہے میرے لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجرم کی عمر نو سال کی ہے یا چالیس کی ؎

نمونہ ہیں خلقِ رسولؐ امیں کے !
ستوں چشمِ بد دور ہیں آپ دیں کے

(ب) مذہبی پیشوائیت کا اقتدار

ایران میں مذہبی پیشوائیت کے اقتدار (تھیاکریسی) پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:۔

اسلام میں "مسٹر اور ملا" کی تفریق نہ تھی یہ ہمارے دورِ زوال کی پیداوار ہے۔ عہدِ سعادت میں مسلمانوں کے راہنما مولوی اور مولانا نہ کہلاتے تھے۔ اس دور کے عوام و خواص میں ہر ایک شخص خود ہی علمِ دین سے مالا مال تھا۔ خلفائے راشدین عرفِ عام میں ویسے مذہبی نہ تھے جیسے اصحابِ صفہؓ۔ ان میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ تاجر تھے اور علیؓ فاتح اور سپہ سالار۔ اگر محض مذہبیت خلافت کے استحقاق کا معیار ہوتی تو یہ حضرات خلیفہ نہ ہوتے اقتدار اصحابِ صفہؓ کے ہاتھ میں آتا جو رات دن مسجدِ نبویؐ کے چبوترے پر علمِ دین حاصل کرنے میں مشغول رہتے تھے، بعد کے دور میں دین و دنیا کی ثنویت کا تصور ابھرا اور آہستہ آہستہ "مولوی" اور "مسٹر" کا تشخص نمایاں ہوا تو چودہ صدیوں میں کبھی بھی مسلمانوں نے مولویوں کے ہاتھ میں حکومت نہیں دی، اس لئے کہ وہ حکومت چلانے کی ضروری تربیت سے محروم تھے، اس کے برعکس اربابِ اقتدار میں اکثریت ایسے غیر مولویوں کی رہی جو سکہ بند مذہبی لوگ تو نہ تھے گنہگار مسلمان تھے لیکن انہوں نے خوفِ خدا کے ساتھ حکومت چلائی اور تاریخ میں نام پیدا کیا۔ اب چودہ صدیوں میں پہلی مرتبہ ایران میں اسلام کے نام پر "تھیوکریسی" قائم کی جا رہی ہے۔ یہ علمائے کرام کی حکومت ہے مگر اس سے اسلام کو جو نقصان پہنچا ہے اور آگے چل کر مزید پہنچے گا وہ پندرھویں صدی ہجری کو قیامت کی صدی بنانے کے لئے کافی ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر ہی سے نہیں خود ایران کی سلامتی اور استحکام کے نقطۂ نظر سے بھی اس سے مہلک دورِ حکومت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

(ج) ایران اور پاکستان

ایران میں تھیاکریسی نے جو تباہی مچائی ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

ہم نے سطورِ بالا میں ایران کی موجودہ نازک صورتِ حال کا جو تجزیہ کیا ہے اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ آنے والے دَور میں ہمارے اس برادر پڑوسی ملک میں کیا کچھ بیتنے والا ہے۔ علامہ خمینی کی زندگی تک تو اس کے بچاؤ کی امید ہے لیکن ان کے بعد حالات کیا ہوں گے اِن کا تصوّر بھی روح فرسا نظر آتا ہے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

اندریں حالات پاکستانی عوام اور حکومتِ پاکستان کے فرائض کیا ہیں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ فرقہ وارانہ مذہبی گروہ ہمارے ملک میں بھی نفرت کا بازار گرم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی گناہ گار مسلمان کا علاج نفرت ہے محبت نہیں۔ ان لوگوں نے بھی سیاست کو مذہب کا درجہ دے دیا ہے کہ جو ان سے اختلاف کرے وہ گردن زدنی ہے۔ مذہب ان کے نزدیک اعلیٰ و ارفع روحانی قدروں کی بجائے محض سیاست ہے اور بس، الیکشن اور کشمکشِ اقتدار ان کے نزدیک جہاد ہے، ان کے پسندیدہ امیدوار کے حق میں ووٹ دینا لیلۃ القدر میں عبادت کرنا ہے، ان کے نزدیک بھی اسوہ اس دَور میں آیت اللہ خلخالی ہیں اور ایران میں ہونے والے کشت وخون کو وہ اسلامی انقلاب کی عبوری اور لازمی منزل سمجھتے ہیں۔

اِس وقت مسلمانوں کے ممالک میں اسلام کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ اُسے قرآنی معیار پر پرکھ کر دیکھا جائے کہ اس میں اسلامی کس قدر ہے اور غیر اسلامی کس قدر۔ حالات کے سازگار ہونے پر طلوعِ اسلام اس فریضہ کی ادائیگی کی بھی کوشش کریگا۔ سردست ہم نیازی صاحب کے بیان تک ہی محدود رہنا چاہتے ہیں۔

(۰)

۶۔ مرتد کی سزا

روزنامہ نوائے وقت نے اپنے ہفتہ واری انگلش سیکشن میں، انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹریبیون کے حوالے سے، ایک انگریزی مقالہ شائع کیا ہے، جس میں ایران میں برپا ہونے والی دہشت انگیزیوں اور خوں ریزیوں کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد، ملخصاً لکھا ہے کہ وہ کونسے "مجرم" ہیں کہ انہیں جس کا جی چاہے قتل کر دے۔ اس حصّہ کو اخبار مذکور نے چوکھٹے میں شائع کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

جس شخص پر بھی، مندرجہ ذیل میں سے کوئی شق عائد ہو سکتی ہو، وہ (MAHDOUR -- AD - DAMM) قرار پاجاتا ہے۔ یعنی اُسے جس مسلمان کا جی چاہے، قتل کر سکتا ہے۔ اُسے سرکاری عدالت میں پیش کئے بغیر، مسلمان قتل کر سکتے ہیں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ دو مرد اس کی گواہی دیں۔ وہ شقیں حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) محارب علی اللہ۔ (خدا کے خلاف جنگ کرنے والا)۔ (۲) مفسد فی الارض۔ (ملک میں

فساد پھیلانے والا)۔ (۳) مشرک۔ (۴) ملحد۔ (۵) مرتد۔ (۶) منکر۔ (مذہب سے انکار کرنے والا)۔ اور (۷) منافق۔"

مرتد کے متعلق تو ہماری فقہ میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ

اسلام پیش کرنے سے پہلے مرتد کو قتل کر دینا مکروہ ہے، لیکن اگر کوئی شخص اسے قتل کر دے تو اس پر نہ قصاص ہے اور نہ تاوان (دیت)

(بحر الرائق۔ بحوالہ "اسلامی حدود" از سید محمد متین ہاشمی۔ صفحہ ۲۲۷)

فقہ کی رُو سے مرتد کون ہوتا ہے، اس کے متعلق ہم کسی دوسری نشست میں گفتگو کریں گے۔ بہرِ دست آپ سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اپنی کتاب "مرتد کی سزا" (اگست ۱۹۵۳ء ایڈیشن۔ صفحہ ۷۶ پر) لکھتے ہیں:۔

میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے" واللہ الموفق للصواب، کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا، تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کیے جائیں گے، فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا، اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے، پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں، انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عملِ تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔

کون اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکا ہے اس کا فیصلہ علماء حضرات کریں گے۔

یہ ہوتا ہے مذہبی پیشواؤں کے اقتدار میں، خواہ وہ ایران میں ہو، یا کہیں اور!

(۰)

۷۔ منجّم اور مشائخ

روزنامہ نوائے وقت کی ۱۵ جولائی ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

معروف منجّم پروفیسر لطیف احمد نے پیش گوئی کی ہے کہ صدر ضیاء الحق مشائخ کی مدد سے ملک کو ایک اسلامی فلاحی ریاست بنا دیں گے۔ جمعیتِ مشائخ پاکستان کی ایک پریس

ریلیز کے مطابق پروفیسر لطیف احمد نے جمعیت کی طرف سے ایک افطار پارٹی میں کہا کہ ستاروں کی نقل و حرکت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں غیر اسلامی آئین منسوخ کر کے اس سال اکتوبر تک اسلامی قوانین نافذ کر دیئے جائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی پیش گوئی کی کہ صدر ضیاء الحق کی حکومت ملک دشمنوں کی تمام سازشوں کو ناکام بنا دے گی۔ انہوں نے کہا کہ ملک دشمن عناصر اپنی موت آپ مر جائیں گے اور ملک، صدر ضیاء الحق کی قیادت میں شاندار ترقی کرے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ صدر ضیاء الحق اسلامی دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور پاکستان ایک مثالی فلاحی مملکت بنے گا جو پوری اسلامی دنیا کی قیادت کرے گا۔

(آمین! خدا کرے کہ پاکستان ایسا بن جائے۔ طلوعِ اسلام)

مشائخ حضرات کی خدمتِ عالیہ میں، اپنی طرف سے کچھ عرض کرنا شاید گستاخی سمجھی جائے لیکن ارشادِ خداوندی کا پیش کرنا، ہمیں امید ہے، سوءِ ادبی تصوّر نہیں کیا جائے گا۔ اللہ تعالےٰ نے انسان سے کہا ہے کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵/۱۳)

ارض و سماوات میں جو کچھ ہے اُس سب کو خدا نے، اپنی نوازشِ بے پایاں کی رُو سے، تمہارے تابعِ تسخیر بنا رکھا ہے۔ اس میں اس قوم کے لئے (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں جو غور و فکر سے کام لے۔

سوال یہ ہے کہ جن آسمانی کُرّوں اور ستاروں کو خدا نے انسان کے تابعِ تسخیر کر رکھا ہے، کیا انسان کو ان کی گردش کے تابع سمجھنا اس ارشادِ خداوندی کی نقیض نہیں؟ اقبالؒ نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے ' کہ خاکِ زندہ ہے تو، تابعِ ستارہ نہیں

اسی بنا پر قرآن نے، آسمانی خبریں لانے کے مدعیوں کے متعلق کہا ہے کہ ان پر آتشیں کوڑے برسائے جاتے ہیں۔ (۱۵/۱۸-۱۶)۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ کے اپنے "کشف و الہام" کو کیا ہوا جو آپ کو منجموں کے سہارے تلاش کرنے پڑے؟

اور آخری بات یہ کہ "پیش گوئی" تو علمِ غیب میں داخل ہے جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ، وہ کسی انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ (۲۷/۶۵)۔

زندہ قومیں، آسمانی کُرّوں کو اپنے زیرِ قدم لا کر قرآن کے اس دعویٰ کو سچا ثابت کر رہی ہیں کہ یہ سب انسان کے تابعِ تسخیر ہیں، اور ہم ابھی تک اپنی قسمت کو ان کے تابع سمجھ رہے ہیں! کیسی پتے کی بات کہ گیا ہے وہ "مجذوبِ فرنگی" (نیٹشے) کہ

میں اس مقام پر کھڑا ہوں جہاں میں اپنی قسمت کے ستاروں کو جھک کر دیکھتا ہوں۔

یہی انسان کا صحیح مقام ہے۔ اور مومن کا مقام تو اس سے بھی کہیں آگے ہے!

(۰)

جُرم کرو ــــ اور ــــ سزا نہ پاؤ

جب پاکستان میں، حدود (سزاؤں) سے متعلق آرڈی نینس جاری ہوا تھا تو امریکہ کے ایک نامہ نگار نے، صدر مملکتِ پاکستان کے ساتھ اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ یہ سزائیں بڑی دہشت انگیز ہیں۔ اس کے جواب میں صدرِ پاکستان نے کہا تھا کہ لوگ صرف ان سزاؤں کو دیکھتے ہیں، اُن شرائط کو نہیں دیکھتے جن کے مطابق یہ سزائیں نافذ العمل ہوں گی۔ ان شرائط کی رُو سے، ہزار میں سے شاید کسی ایک مجرم کو یہ سزا مل سکے۔ یہ شرائط فقہ کی کتابوں میں منقول تھیں اور مذکورہ بالا آرڈی نینس میں ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا گیا تھا۔ اب سیّد محمد متین ہاشمی کی طرف سے "اسلامی حدود" کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں سزاؤں سے متعلق فقہی احکام کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ہم اس (کتاب) میں سے صرف ان شرائط کو درجِ ذیل کرتے ہیں جن کے پورا نہ ہونے (یا جن کے مطابق جرم سرزد ہونے) سے مجرم پر (حد) کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ مسٹر جسٹس شمیم حسین قادری، قائم مقام چیف جسٹس، لاہور ہائی کورٹ، نے کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

> مولانا سیّد محمد متین ہاشمی کی تالیف، اسلامی حدود، میری نظر سے گذری ہے۔ مؤلف موصوف نے نہایت جانفشانی اور عرق ریزی سے فقہ کی معروف کتابوں سے استفادہ کر کے اسلامی حدود پر جامع تبصرہ کیا ہے۔ یہ کتاب نظامِ اسلام کے نفاذ کے لئے نہایت سودمند ثابت ہو سکتی ہے۔ میں مؤلف موصوف کو ان کی اس کاوش پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اسلامی فقہ سے رغبت رکھنے والے احباب کے لئے یہ نسخہ ایک اچھا خزینہ ثابت ہوگا۔

اب ان شرائط کو دیکھئے جن کے پورا نہ ہونے سے (فقہ کی رُو سے) مجرم پر حد عائد نہیں ہو سکتی۔ واضح رہے کہ ہم ان قوانین کو (بجز ان کے جو قرآن کے مطابق ہوں) نہ صحیح مانتے ہیں نہ اسلامی۔ ہم انہیں محض اس لئے شائع کر رہے ہیں کہ پاکستان میں فقہی قوانین رائج ہو رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام کو معلوم ہو کہ یہ قوانین کس قسم کے ہیں۔ اس کتاب میں، ہر قانون کی تائید میں فقہ کی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ لیکن ہم صرف زیرِ نظر کتاب (کے دوسرے ایڈیشن) کے صفحات کے حوالوں پر اکتفا کریں گے۔ بعض مقامات پر چند ایک الفاظ اپنی طرف سے اضافہ ہیں۔ انہیں ہم نے قوسین میں درج کیا ہے۔

۱- عام رجحان

کتاب کے شروع میں کہا گیا ہے کہ اسلامی قانون کا عام رجحان یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، کوشش کی جائے کہ ملزم سزا سے بچ جائے۔ اس کی تائید میں دو ایک نظائر ملاحظہ ہوں۔

(۱) "حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جتنا تم سے ہو سکے مسلمانوں سے حدود کو دفع کیا کرو۔ اگر اس بات کی ذرا بھی گنجائش ہو کہ ملزم سزا سے بچ جائے تو اسے بچ جانے دو، کیونکہ معاف کر دینے میں اگر حاکم سے غلطی ہو جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ سزا دینے میں غلطی کرے۔" (ص۱۸)

(۲) "ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے کہ جب حضرت ماعزؓ کو (جنہیں جرم زنا کی پاداش میں رجم کی سزا دی جا رہی تھی) پتھر کی سخت چوٹ لگی تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن عبداللہ بن انیسؓ نے انہیں اونٹ کی ایک ہڈی سے ایسا مارا کہ وہ ہلاک ہو گئے۔ پھر جب عبداللہ بن انیسؓ نے حضورؐ سے یہ واقعہ بتایا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ——— تم نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ توبہ کرتا اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول کر لیتا۔" (ص۲۰)

(۳) "حضرت ماعز اسلمیؓ نے قبیلے کی ایک باندی سے زنا کیا اور انہوں نے سب سے پہلے حضرت ہزالؓ کے پاس اعتراف کیا۔ ہزالؓ نے انہیں مشورہ دیا کہ تم حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اعتراف کرو۔ شاید آپؐ تمہارے لئے کوئی راستہ نکال دیں۔ آپ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپؐ نے ہزالؓ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ——— اگر تو اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیتے ہوتا تو تیرے حق میں بہتر ہوتا۔" (ص۲۰)

(۴) (ملزم کے اعتراف سے جرم ثابت ہو جاتا ہے۔ کوشش کرنی چاہیئے کہ ملزم اپنے اقرارِ جرم سے پھر جائے)۔

"حضورؐ کی خدمت میں ایک چور نے چوری کا اعتراف کیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ——— کیا اس نے چوری کی ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ اس نے چوری نہیں کی ہوگی" ——— حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ ——— اقرار جرم کرنے والوں کو بھگا دیا کرو۔" (ص۲۳)

———(۰)———

اب جرائم کی طرف آیئے۔

جرم زنا (جس کی سزا سو کوڑے اور رجم بتائی جاتی ہے)

(۱) "رجم کی صورت میں سب سے پہلے گواہوں سے (جن کی شہادت کی بنا پر زنا کا جرم ثابت ہوا تھا) پتھر مارنے کو کہا جائے گا۔ اگر وہ پتھر مار دیں تو ٹھیک ہے۔ اگر انکار کر دیں تو رجم نہیں کیا جائے گا۔" (ص۳۹)

(۲) "اگر کسی شخص نے کسی عورت کے ساتھ زنا کیا۔ پھر اس سے نکاح کر لیا تو امام یوسفؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس پر حد نہیں جاری کی جائے گی۔" (ص۴۸)

(۳) "امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک، زانی مرد اور زانیہ عورت میں سے اگر کوئی ایک بھی زنا کا انکار کر دے، درآنحالیکہ دوسرا فریق زنا کا اقرار کر رہا ہو، تو منکر (انکار کرنے والے) پر تو حد جاری ہی نہیں ہوگی۔ معترف (اقرار کرنے والے) پر بھی اجرائے حد نہیں ہوگا۔" (ص۴۹ ز ص۲۹)

(۴) "اگر ایک فریق کہے کہ اس نے زنا کیا ہے اور دوسرا یہ دعویٰ کرے کہ مزنیہ (جس عورت سے زنا کیا گیا ہے) سے اس کا نکاح ہو چکا ہے تو امام ابوحنیفہ اور امام احمدؒ کے نزدیک حد جاری نہیں کی جائے گی۔" (ص۵۰)

(۵) "اگر کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ مباشرت کرتا ہوا پکڑا جائے اور عورت اور مرد دونوں کہیں کہ ہمارا آپس میں نکاح ہو چکا ہے، تو جمہور فقہا کے نزدیک دونوں میں سے کسی پر حد نہیں لگائی جائے گی۔" (ص۵۰)

(۶) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر دارالحرب میں کوئی شخص زنا کا ارتکاب کرے تو اس پر حد نہیں جاری ہوگی۔" (ص۵۲)

(یعنی اگر کوئی شخص، واہگہ کی سرحد سے اُس پار کھیت میں زنا کا مرتکب ہو تو اس پر حد جاری نہیں ہوگی)۔

(۷) اگر کوئی شخص مجلسِ قضا (عدالت) میں جرم کا اقرار کرے، لیکن بعد میں اپنے اقرار سے پھر جائے، تو حد جاری نہیں ہوگی۔" (ص۷)

(۸) زنا کی سزا سو کوڑے ہے۔ "حضورؐ کے زمانے میں ایک شخص پر زنا کا جرم ثابت ہو گیا لیکن وہ بہت لاغر تھا۔ آپؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ کھجور کی ایک ایسی شاخ لی جائے جس میں سو شاخیں (ٹہنیاں) ہوں۔ اور اس سے ایک مرتبہ اسے مار دیا جائے۔" (ص۳۵)

(۹) "حضورؐ نے فرمایا، جو شخص کسی جانور سے صحبت کرے، اسے قتل کر دو اور جانور کو بھی قتل کر دو۔" (ص۴۴)

لواطت (اغلام)

"حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اس فعل کے مرتکب کو آگ میں جلا دینا چاہیئے۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ لواطت نہ زنا ہے، نہ زنا کے حکم میں ہے۔ اس لئے اس میں حد جاری نہیں کی جائے گی۔" (ص۵۰)

قذف

(قذف کے معنی ہیں کسی پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانا۔ قرآنِ کریم کی رُو سے اس کی سزا، اسی کوڑے ہے۔ اس کے متعلق اس کتاب میں ہے):-

(۱) "اگر چار سے کم گواہ واقعہ زنا پر شہادت دیں تو ان تمام گواہوں پر حدِ قذف عائد ہو جائے گی"۔ (ص ۶۶)

(۲) "اگر چار گواہ کسی آدمی کے بارے میں زنا کی شہادت دیں اور ان کی بنیاد پر ملزم پر حد جاری کر دی جائے، لیکن بعد میں پتہ چلے کہ ان چاروں گواہوں میں سے ایک گواہ محدود فی القذف تھا۔ (یعنی اس پر تہمت کی حد لگ چکی تھی) تو پھر ان بقیہ تین گواہوں پر حدِ قذف لگے گی"۔ (ص ۶۶)

(۳) "اگر چار گواہ زنا کی شہادت دیں اور ان کی شہادت پر کسی کو رجم کر دیا جائے۔ بعد میں کوئی گواہ اپنی شہادت سے رجوع کر لے، تو گواہی سے پھر جانے والے شخص پر حدِ قذف لگائی جائے گی۔ لیکن اگر وہ نفاذِ حد سے پہلے اپنی شہادت سے پھر جائے، تو پھر تمام گواہوں کو حدِ قذف لگائی جائے گی"۔ (ص ۶۶)

(۴) "امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک، قاذف پر حدِ قذف اسی وقت لگے گی جبکہ قاذف نے دارالاسلام میں رہتے ہوئے تہمت لگائی ہو۔ اگر تہمت لگاتے وقت قاذف دارالحرب یا دارالبغی میں تھا تو اس پر حد جاری نہیں ہوگی"۔ (ص ۶۶)

(واضح رہے کہ جرم زنا کے اثبات کے لئے چار ایسے گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے جنہوں نے اس فعل کے ارتکاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔)

———— (۰) ————

خمر (شراب نوشی)

(خمر کو جرم تو قرار دیا گیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ خمر کہتے کسے ہیں؟)

(۱) "امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک صرف مندرجہ ذیل مشروبات "خمر" کے حکم میں داخل ہیں:۔

(الف) انگور کا شیرہ، جبکہ وہ پک کر تیز ہو جائے اور اس پر جھاگ آ جائے۔

(ب) انگور کے شیرے کو اس طرح پکایا جائے کہ اس کا دو تہائی حصہ جل جائے اور وہ نشہ آور ہو جائے۔

(ج) کچی یا نیم پختہ کھجوروں کا شیرہ جبکہ وہ پک کر تیز ہو جائے اور اس پر جھاگ آنے لگے۔

ان کے علاوہ، گندم۔ جو اور چاول کے مشروبات جو نشہ آور نہ ہوں، حلال ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مذکورہ بالا اشیاء سے تیار کئے ہوئے مشروبات اس وقت تک شراب کے حکم میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ نشہ پیدا کریں"۔ (ص ۹۴)

(۲) "امام ابو حنیفہؒ اور ابو یوسف کے نزدیک، اگر شراب کی بو دور ہو جانے کے بعد کوئی شخص اقرار کرے یا بو دور ہو جانے کے بعد گواہان گواہی دیں، تو حد جاری نہیں ہوگی"۔ (ص ۱۰۶)

(۳) "امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ محض نشہ بطور ثبوت کے کافی نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ شراب اس نے کسی عذر شرعی کی وجہ سے پی ل ہو، یا جبراً اسے پلا دی گئی ہو"۔ (ص ۱۰۸)

(۴) "جو شخص شراب نوشی کا اقرار کرے۔ اس کے بعد اپنے اقرار سے پھر جائے، تو اس پر حد نہیں ہوگی"۔ (ص ۱۱۱)

(۵) "اگر کسی کے پاس سے شراب برآمد ہو جائے تو اس پر حد نہیں ہوگی (البتہ تعزیر ہو سکتی ہے)"۔ (ص ۱۱۱)

———— (۰) ————

سرقہ (چوری) جس کی سزا ہاتھ کاٹ دینا ہے۔

(۱) "اگر چور کا ایک ساتھی مکان کے باہر ہو، دوسرا مکان میں چوری کر کے، مالِ مسروقہ اس ساتھی کو تھمادے۔ جو باہر کھڑا ہو، تو دونوں میں سے کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام یوسف فرماتے ہیں کہ اگر باہر والے نے مال پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ حرز (محفوظ مقام، یعنی مکان) میں داخل کیا تو دونوں کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ لیکن اگر اندر والے نے مال پکڑانے کے لئے اپنا ہاتھ حرز سے باہر نکالا ہو، تو پھر اندر والے کا ہاتھ کاٹ دیا جائیگا۔" (ص ۱۱۹)

(واضح رہے کہ سرقہ کی شرط یہ ہے کہ مال کسی محفوظ مقام سے چرایا گیا ہو)۔

(۲) "کسی مکان کا دروازہ یا مسجد کا دروازہ چرا لینے پر حد جاری نہیں ہوگی۔ غلافِ کعبہ یا کعبہ کا دروازہ چرا لینے پر بھی حد جاری نہیں ہوگی۔" (ص ۱۲۱)

(۳) "اگر کوئی شخص کسی کے ہاں مہمان ہو، اور میزبان کے مال کو چرا لے، تو دیکھا جائے گا کہ اس نے کہاں سے مال چرایا۔ اگر اسی کمرے سے چرایا ہے جہاں وہ ٹھہرایا گیا تھا، تو اس پر حد جاری نہیں ہوگی۔ اور اگر اس جگہ سے چرایا جہاں اس کا داخلہ ممنوع تھا تو حد جاری ہوگی۔" (ص ۲۲-۱۲۱)

(۴) "کسی نے کسی کا مال چرا کر یا غصب کر کے اپنے مکان میں بحفاظت رکھا اور اس مال کو کوئی دوسرا چور چرا لے گیا تو اس دوسرے چور پر حد جاری نہیں ہوگی۔" (ص ۱۲۲)

(ص ۱۲۳)

(۵) "چور نے سامان مکان کے کمرے سے نکال کر دالان میں رکھا ہی تھا کہ پکڑا گیا، تو اس پر حد جاری نہیں ہوگی۔"

(۶) "اگر چور نے مکان میں نقب لگائی اور سوراخ میں ہاتھ ڈال کر مال نکال لیا یا کوئی چھڑی یا بانس ڈال کر مال باہر کھینچ لیا، خود مکان میں داخل نہ ہوا، تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قطع ید نہیں ہوگا۔" (ص ۱۲۴)

(۷) "اگر چور کے کسی ساتھی نے نقب لگانے، دروازہ توڑنے، دروازہ کھولنے، دیوار پر چڑھنے اور مالِ مسروقہ اٹھا کر لے جانے میں اپنے ساتھی کی مدد کی، لیکن حرز میں داخل نہیں ہوا، تو اس کا قطع ید نہیں ہوگا بلکہ تعزیر ہوگی۔" (ص ۱۲۵)

(۸) اونٹوں کی ایک قطار جا رہی تھی۔ کسی نے اس قطار میں سے ایک اونٹ کو پکڑ کر نکال لیا یا اس پر جو مال لدا ہوا تھا وہ مال اتار لیا، تو قطع ید نہیں ہوگا۔" (ص ۱۲۶)

(آجکل چلتی مال گاڑی میں سے مال چرا لینے پر بھی غالباً یہی فیصلہ لاگو ہوگا!)

(۹) "ایک شخص نے کسی کو کوئی چیز کرایہ پر دی اور پھر خفیہ طور پر وہ چیز اپنے قبضے میں لے لی (چرا لی)۔ یا کسی نے کسی کو اپنا وکیل بنایا تھا۔ پھر اپنی مصلحتوں کی بنا پر وکیل کے قبضے سے اپنا مال خفیۃً نکال لیا۔ یا کسی نے کسی کے پاس امانت رکھی تھی۔ پھر خفیہ طور پر وہ مال اس کے قبضے سے نکال لیا۔ یا کسی نے کسی کے پاس کوئی مال گروی رکھا تھا، اور اپنے مصالح کے تحت وہ مال خفیہ طور پر اس کے قبضے سے نکال لیا۔ تو اسے سرقہ نہیں قرار دیا جائے گا۔" (ص ۳۲-۱۳۱)

(۱۰) "اگر گھر کے کسی خادم نے، جو مال کو رکھا کرتا تھا، اس مال میں سے چرا لیا تو اسے سرقہ نہیں کہیں گے۔

اور نہ خادم پر حد جاری کریں گے۔" (ص ۱۳۲)

(۱۱) اگر کسی نے اپنے والد، دادا، پردادا، یا بیٹے، پوتے یا پڑپوتے، یا بہن، بھائی، چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ کا مال چرا لیا تو قطع ید نہیں ہوگا۔" (ص ۱۵۰)

(۱۲) "شوہر اگر بیوی کا مال چرا لے، یا بیوی شوہر کا تو قطع ید نہیں ہوگا۔" (ص ۱۵۰)

(۱۳) "سسرال سے مال چرا لینے پر قطع ید نہیں ہوگا۔" (ص ۱۵۱)

(۱۴) کسی اجنبی عورت کا مال چرا لیا اور پھر اس سے نکاح کر لیا، تو چور کے اقرار کر لینے کے باوجود اس کا قطع نہیں ہوگا۔" (ص ۱۵۱)

(۱۵) کسی شخص نے کسی کو سو روپے کا نوٹ دیا کہ اس کا بھان لے آئے، وہ شخص نوٹ لے کر چمپت ہو گیا۔ یا کسی شخص نے ہوٹل قائم کیا اور برتن وغیرہ باورچی کے حوالے کئے، اور باورچی وہ برتن لے کر بھاگ گیا۔ تو ان صورتوں ... کو سرقہ نہیں کہا جائے گا۔ اور حد جاری نہیں ہوگی۔" (ص ۱۳۳)

(۱۶) "اگر چوروں کی ایک جماعت نے مل کر ارتکاب جرم کیا، اور ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو اس شخص کا قریبی رشتہ دار تھا جس کا مال چرایا گیا، تو کسی پر بھی حد جاری نہیں ہوگی۔" (ص ۱۳۶)

(۱۷) امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک، مٹی - اینٹ - چونا - شیشے کی چوری پر قطع نہیں، بشرطیکہ وہ صنعت یا تجارت کے لئے نہ رکھے گئے ہوں۔" (ص ۳۸-۱۳۷)

(۱۸) "امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک، کفن چور کا قطع ید نہیں ہوگا۔" (ص ۱۴۱)

(۱۹) "درخت کے پھل اور کھیت کی سبزی چرا لینے پر قطع ید نہیں ہوگا۔ (ص ۱۴۱)" "اسی طرح کھلیان سے ایسی فصل چرا لینے پر بھی قطع ید نہیں ہوگا جو پوری طرح خشک نہ ہوئی ہو۔" (ص ۱۴۳)

(۲۰) "اگر کسی نے بکری - بھیڑ - اونٹ - گائے - گھوڑا - گدھا - خچر اور بھینس، چراگاہ سے چرا لی تو قطع ید نہیں ہوگا۔" (ص ۱۴۴)

(۲۱) "اگر کسی مکان کا دروازہ کھلا ہو اور کوئی شخص دن کے وقت داخل ہو کر مکان سے کوئی چیز (بقدر نصاب) چرا لے تو قطع ید نہیں ہوگا۔" (ص ۱۴۶)

(۲۲) زید کو کسی مکان میں آنے جانے کی عام اجازت تھی اور زید اس میں آتا جاتا بھی تھا، پھر اس نے اس مکان میں سے کوئی چیز (بقدر نصاب) چرا لی تو زید کا قطع ید نہ ہوگا۔" (ص ۱۴۷)

(۲۳) "ایک چور ایک گدھا لے کر مکان میں داخل ہوا۔ اس نے مال سمیٹا اور گدھے پر بار کر دیا۔ پھر خود مکان سے خالی ہاتھ نکل آیا۔ گدھا، مکان سے مالِ مسروقہ کے ساتھ نکلا اور چور کے گھر چلا آیا تو قطع ید نہیں ہوگا۔" (ص ۱۴۸)

(۲۴) "کسی نے اپنی کار عام شاہراہ پر کھڑی کر دی اور بلا کسی نگران کی موجودگی کے اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ تو وہ کار غیر محرز (غیر محفوظ) سمجھی جائے گی۔ اس کی چوری پر قطع ید نہیں ہوگا۔" (ص ۵۲-۱۵۱)

(۲۵) "تجارتی مراکز اور ریسٹورنٹ سے ایسے اوقات میں جبکہ کاروبار ہو رہا ہو، یا عام داخلے کی

اجازت ہو، کوئی شخص وہاں سے چوری کرے، تو قطع ید نہیں ہوگا۔" (ص ۱۵۳)
(۲۶) "کسی نے قبر میں مال چھپا دیا تھا۔ قبر کھود کر کسی نے وہ مال نکال لیا تو قطع ید نہیں ہوگا۔" (ص ۱۵۴)
(۲۷) "کسی انسان یا کسی بچہ کو چرا لیا جائے تو سرقہ نہیں ہوگا۔" (البتہ بچے کی چوری موجب تعزیر ہوگی۔ حد نہیں)" (ص ۱۶۶)۔
(۲۸) اگر ایسا مال چوری ہو گیا جس کا مالک غائب یا مجہول ہے، تو خواہ سارق اقرار ہی کیوں نہ کرے، امام صاحب کے نزدیک حد جاری نہیں ہوگی۔" (ص ۱۶۷)
(۲۹) "امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس مال کی چوری پر حد جاری نہیں ہوگی جس کی ملکیت میں ملک کے اکثر عوام شریک ہوں۔ مثلاً بیت المال سے چوری۔ یا مالِ غنیمت سے چوری۔" (ص ۱۶۸)
(اس اعتبار سے حکومت کی کسی بھی چیز کے چرانے پر حد عائد نہیں ہوگی کیونکہ وہ قوم کی ملکیت ہوتی ہے)
(۳۰) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک، اگر چور مالِ مسروق پر ملکیت کا دعویٰ کر دے، تو محض دعویٰ کر دینے ہی سے حد ساقط ہو جائے گی اور اُسے تعزیر دی جائے گی۔" (ص ۱۶۸)
(۳۱) "برف کی چوری بھی سرقہ میں داخل نہیں۔" (ص ۱۷۰)
(۳۲) "سرقہ موجب حد ہونے کے لئے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ ارتکابِ سرقہ دار العدل میں کیا جائے۔ اگر دار الحرب یا دار البغی میں سرقہ کیا جائے، تو چاہے صاحبِ مال دار الحرب میں اور سارق دار العدل ہی میں کیوں نہ رہتا ہو، سارق پر حد جاری نہیں ہوگی۔" (ص ۱۳۴)

(اور سب سے اہم)

(۳۳) "سرقہ کی فرد جرم عائد کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ زمانہ جس میں عملِ سرقہ کا صدور ہوا ہو، قحط سالی کا زمانہ نہ ہو۔ قحط سالی کے زمانے میں بھوک سے پریشان ہو کر اگر کوئی شخص عملِ سرقہ کا ارتکاب کرے تو اس پر حد جاری نہیں ہوگی۔ اسی ضمن میں وہ صورت بھی آتی ہے جبکہ کوئی شخص بہت بھوکا ہو، اور پیسے پاس ہوتے ہوئے بھی کھانے کی چیز دستیاب نہ ہو، یا اتنے پیسے ہی نہ ہوں کہ وہ کھانے کی چیز خرید کر کھا لے اور بھوک نے اسے بے حال کر رکھا ہو، وہ حسبِ ضرورت چوری کر لے، تو اس پر حد جاری نہ ہوگی۔" (ص ۱۳۴-۱۳۳)
(حد تو ایک طرف، اسے کسی جرم کا بھی مرتکب قرار نہیں دیا جائے گا حضرت عمرؓ کے فیصلے کی رُو سے، سزا انہیں دی جائے گی جنہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے جن کی رُو سے وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گیا)۔

(۰)

جُرم کا ثبوت۔ اقرار۔ شہادت

(۱) "عورتوں کی شہادت حدود میں مقبول نہیں ہوگی۔" (ص ۱۴۴)

(۲) "دیگر حقوق میں ادائے شہادت فرض ہے لیکن حدود میں شاہد (گواہ) کو اختیار ہے کہ وہ شہادت دے، یا پردہ پوشی کرے۔ اور پردہ پوشی افضل ہے۔" (صفحہ ۱۷۲)

(۳) "اگر چور نے اقرار کیا لیکن اپنے اقرار میں یہ کہا کہ میں نے یہ مال چرایا ہے لیکن میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ اس کا مالک کون ہے۔ یا یہ کہ میں نے یہ روپے چرائے ہیں لیکن میں نہیں جانتا کہ یہ کس کے ہیں، تو ان دونوں صورتوں میں بقولِ امام محمدؒ، قطع نہیں ہوگا۔" (صفحہ ۱۸۳)

(۴) "اقرار بالاِکراہ (مار پیٹ کر سارق سے سرقہ کا اقرار کرانا) موجبِ حد نہیں۔ لیکن اگر وہ مال کا اقرار کرے تو اسے مال واپس کرنا ہوگا، یا مال کا تاوان ادا کرنا ہوگا۔" (صفحہ ۱۸۵)

(۵) "اگر اجرائے حد سے قبل سارق اپنے اقرار سے رجوع کرے، یا کوئی ایسی بات کہہ دے جس سے شبہ پیدا ہو جائے، تو حد ساقط ہو جائے گی۔" (صفحہ ۱۸۵)

(۶) "حاکم کے لئے مستحب ہے کہ وہ ملزم کو اس بات کی تلقین کرے کہ وہ چوری کا اقرار نہ کرے تاکہ اس سے حد کو رفع کر دیا جائے۔" (صفحہ ۱۸۴)

(۷) "اگر چور، چوری کا اقرار کرنے کے بعد بھاگ جائے تو اس کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی جائیگی۔" (صفحہ ۱۸۳)

(۸) "اگر کسی انجکشن کے ذریعے مجرم کا ہاتھ کاٹنے سے پہلے سُن کر دیا جائے تو شرعاً کوئی مضائقہ نہیں۔" (صفحہ ۱۹۶)

———— (٠) ————

یہ ہیں وہ احوال و شرائط جن کے تحت، ان جرائم کا مجرم، ارتکابِ جرم (بلکہ اقرارِ جرم) کے باوجود حد سے بچ سکتا ہے۔ (کتاب میں اور بھی بہت سی شرائط و احوال ہیں، لیکن ہم نے انہی پر اکتفا کیا ہے) اگر کوئی مجرم اتنے کھلے ہوئے راستوں کے باوجود، اپنے آپ کو سزا کا مستوجب بنا لیتا ہے تو اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جائے گا کہ وہ بڑا ہی بدقسمت ہے!

(ضمناً) آپ نے دیکھا ہوگا کہ مندرجہ بالا قوانین میں ہر مقام پر کہا گیا ہے کہ "فلاں امامؒ کا فتویٰ یا فیصلہ یوں ہے۔" اس کے یہ معنی ہیں کہ دیگر ائمہ کا فیصلہ اس سے مختلف ہے۔ فقہ کے ہر قانون کی یہی کیفیت ہے۔ اس میں مختلف ائمہ فقہ کے مختلف فیصلے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو مختلف فرقوں کی فقہیں مختلف ہیں۔ اور تماشا یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ ان کی فقہ اسلام کے مطابق ہے۔

———— (٠) ————

نوٹ:۔ ہم نے یہ فقہی احکام، ہاشمی صاحب کی کتاب سے نقل کر دیئے ہیں۔ ہم نہ تو ان کی صحت کے ذمہ دار ہیں اور نہ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں ان کی پوزیشن کیا ہے۔

———— (٠) ————

باسمہٖ تعالیٰ

ارشادِ خداوندی بزبانِ رسالتؐ

سوچا کرو

پرویز

سوچا کرو

پرویز

قرآنِ کریم کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ اس نے وسیع و عریض کارگہِ کائنات کے حقائق اور نفسِ انسانی کے عمیق و دقیق رموز و اسرار، ایسے مرتکز (CONCENTRATED) انداز سے بیان کئے ہیں کہ اس کے ایک ایک قطرے میں سمندر سمویا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے جامع صحیفۂ کائنات، اور مکمل ضابطۂ حیات کی ضخامت اتنی مختصر ہے کہ اگر اسے انگریزی زبان کے باریک ٹائپ میں چھاپا جائے تو چند اوراق میں قلمبند ہو جائے۔ اس کے تحیر انگیز اختصار کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

حضور نبی اکرمؐ نے عمر بھر، قرآنِ کریم کی انسانیت ساز تعلیم، قریش کے سامنے پیش کی اور انہوں نے اس کی جی بھر کے مخالفت کی۔ آخر الامر، آپؐ نے ان سے ایک دن کہا کہ میں عمر بھر تم سے تفصیلی گفتگوئیں کرتا رہا ہوں، لیکن آج میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں ـــــ صرف ایک بات:۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ..... اے رسول! ان سے کہو کہ میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

انہوں نے جی میں کہا کہ یہ صرف ایک بات کہنا چاہتا ہے۔ اس کے سن لینے میں کیا حرج ہے؟

انہیں اس طرح آمادہ پا کر آپؐ نے فرمایا کہ وہ بات ایسی معمولی نہیں کہ تم اسے یونہی چلتے چلتے سن لو۔ وہ بڑی اہم بات ہے اس لئے اسے کھڑے ہو کر دل کے کانوں سے سنو ـــــ سب نہیں تو ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ..... جب آپؐ نے انہیں اس طرح نفسیاتی طور پر اپنی طرف متوجہ کر لیا تو فرمایا کہ میں جو بات تم سے کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ..... (۳۴/۴۶)

تم، سوچا کرو۔

اس ایک لفظ میں، قرآنِ کریم نے حقائق و رموزِ انسانی کی کتنی دنیائیں سمٹا کر رکھ دی ہیں، اس کا صحیح اندازہ وہی قومیں لگا سکتی ہیں جو عقل و فکر کی اہمیت سے واقف ہیں۔ ہمارے لئے تو اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ سارا قرآن، عقل و فکر اور غور و تدبر کی تاکید سے بھرا پڑا ہے، حتیٰ کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ انسان نہیں، حیوان ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے۔ (۷/۱۷۹) یہ اہلِ جہنم میں سے ہیں۔ (۷/۱۷۹)۔

قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے، وہ انسان نہیں، بلکہ حیوانی سطح پر زندگی بسر

کرتے ہیں، نہ صرف فکرِ انسانی کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے بلکہ اس کی تخلیقی تاریخ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ قرآنی حقائق (اور عصرِ حاضر کے سائنٹیفک انکشافات) کی رُو سے زندگی (کسی خاص فرد یا نوع کی زندگی نہیں بلکہ خود زندگی) اوّلیں جرثومۂ حیات کے نقطۂ آغاز سے، اپنی ارتقائی منازل طے کرتی، پیکرِ انسانی تک پہنچی ہے۔ اس کے اس سفر میں دو باتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں، یعنی:-

تکرار ہی تکرار

(۱) جس نوع نے جس مقام پر کشمکشِ حیات سے منہ موڑ لیا وہ اسی مقام پر رک کر رہ گئی۔ آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس کا مقصدِ حیات اپنے آپ کو دھرائے چلے جانا (REPETITION) یا (REPRODUCTION) رہ گیا۔ لاکھوں، کروڑوں سال سے چھپکلی اپنے جیسی چھپکلیاں پیدا کر کے ختم ہو جاتی ہے۔ بکری، اپنے جیسی بکری ہی پیدا کر سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، جب کوئی نوع ایک مقام پر رُک جاتی ہے تو اس کی زندگی کی حرکت دَوری (CYCLIC) رہ جاتی ہے، ارتقائی یا صراطی (EVOLUTIONARY) نہیں رہتی۔ اور

(۲) ہر نوع جو آگے بڑھتی ہے اس میں، سابقہ نوع کے مقابلہ میں، دماغی استعداد کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ جب کوئی نوع کسی مقام پر رُک جاتی ہے تو اس کی "ذہنی استعداد" بھی وہیں کی وہیں منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔

زندگی جب انسانی پیکر میں پہنچی تو اس کی "ذہنی استعداد" کو فکر سے تعبیر کیا گیا۔ فکری صلاحیت، خاصۂ انسانیت ہے۔ حیوان اس سے محروم ہیں۔ یہ وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے فکری صلاحیتوں کو کام میں نہ لانے والے انسانوں کو اُولٰٓئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ..... (۷/۱۷۹) کہہ کر پکارا ہے یعنی حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والے، بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ، کیونکہ حیوانات (کم از کم) اپنی جبلّی صلاحیتوں (INSTINCT) سے تو کام لیتے ہیں!

سطحی ہیں لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر نظریۂ ارتقاء صحیح ہے تو انسان کسی اور نوع میں تبدیل کیوں نہیں ہو گیا؟ وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اب ارتقاء، جسموں اور پیکروں کے تغیّر و تبدّل کی شکل میں نمودار نہیں ہوتا۔ منزلِ انسانیت میں پہنچ کر، فکری ارتقاء کا آغاز ہوا ہے اور اس ارتقاء کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

فکری ارتقاء

ذرا سوچئے کہ کیا لاکھوں سال پہلے کا غاروں میں بسنے والا انسان، اور چاند ستاروں کو مسخر کرنے والا آج کا انسان، فکری طور پر ایک ہی نوع کے افراد ہیں؟ آج کا انسان، غاروں میں بسنے والے انسان سے یقیناً ایک مختلف "نوع" کا انسان ہے۔

وحی کا مقصد، انسانی فکر کو جِلا دے کر، اس کی آماجگاہ کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلا جانا ہے۔ جہاں تک فکری جِلا کا تعلق ہے، قرآنِ کریم شروع سے آخر تک، غور و تدبّر پر زور دیئے چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ۝ (۴۷/۲۴)

یہ لوگ قرآن میں غور و تدبّر نہیں کرتے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے دلوں نے اپنے اوپر

خود وضع کردہ تالے ڈال رکھے ہیں تاکہ ان کے اندر کچھ داخل ہی نہ ہو سکے۔

وہ ان لوگوں کو مومن ہی تسلیم نہیں کرتا جو عقل و فکر سے کام لئے بغیر، کسی بات کو یونہی سچا مان لیں۔ وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ (۲۵/۷۳)

یہ وہ لوگ ہیں کہ، اور تو اور، جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں، تو وہ ایسا نہیں کرتے کہ عقل و فکر کو بالائے طاق رکھ کر، اندھوں اور بہروں کی طرح ان پر گر پڑیں۔ وہ انہیں علم و بصیرت کی رُو سے تسلیم کرتے ہیں۔

جہاں تک انسانی فکر کے میدان کی توسیع کا تعلق ہے، وہ کہتا ہے کہ

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ط ..... (۲/۲۱۹)

اس طرح اللہ تعالےٰ حقائق کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے تاکہ دنیا اور آخرت، دونوں کی زندگی پر غور و فکر کر سکو۔

انسان کو فکری صلاحیت عطا کر کے، اسے حیوانات سے ممتاز کر دیا۔ اور، اُخروی زندگی کو فکر کے دائرے میں شامل کر کے، مومن اور کافر میں امتیاز کر دیا۔ لہٰذا الدین (اسلام) نام ہے، دنیا اور آخرت کی زندگی میں غور و فکر سے کام لینے کا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سلسلۂ ارتقاء کی رُو سے، انسان کی فکری صلاحیت بڑھتی اور بلند ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے کسی ایک دَور (زمانہ) کی فکری سطح حرفِ آخر نہیں قرار پا سکتی۔

دین یہ کچھ کرتا ہے۔ اس کے برعکس مذہب، کسی ایک زمانہ کی فکری سطح کو حرفِ آخر قرار دے کر، اسے وہیں منجمد کر دیتا ہے۔ اس سے انسانی زندگی، حیوانی سطح (کالانعام) پر پہنچ جاتی ہے اور اس کا مقصد (آگے بڑھنے کے بجائے) تکرار (REPITITION) رہ جاتا ہے۔ یعنی جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اسے ابدی طور پر غیر متبدل قرار دے کر، اس کی ہو بہو نقل کرتے رہنے کو مقصدِ حیات سمجھ لینا۔ اسے مذہب کی اصطلاح میں تقلید کہتے ہیں۔ قلادہ اس رسی یا طوق کو کہتے ہیں جسے مویشیوں کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے، اور اس سے مویشی کو جدھر جی چاہے چلایا جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ معانی کے اعتبار سے بھی تقلید سے انسان کی پوزیشن کیا ہو جاتی ہے۔ چونکہ تقلید (مذہب) کا مدار عقل و فکر پر ہوتا ہی نہیں، اس لئے اس میں سوچ کو حرام قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہزاروں سال پہلے کی انسانی فکر اس قابل ہوتی ہی نہیں کہ وہ اتنے زمانے بعد کی فکر کو دلائل سے مطمئن کر سکے۔ بجائے اس کے کہ مذہب اس حقیقت کا اعتراف کرے، وہ سرے سے غور و فکر ہی کو حرام قرار دے دیتا ہے۔ اس خود فریبی یا ابلہ فریبی سے وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے مسلک کو "الحاد و بے دینی" کے حملوں سے محفوظ کر لیا ہے۔ اگر کہیں سے دلیل طلبی کی آواز اٹھتی ہے تو وہ عوام کے جذبات کو یہ کہہ کر مشتعل

کر دیتا ہے کہ یہ شخص تمہارے سلفِ صالحین اور ائمہ مقدسین کے مسلک کو جھوٹا کہتا ہے۔ عوام پر عقل و فکر کے دروازے پہلے ہی بند ہوتے ہیں۔ جب ان کے جذبات کو بھڑکا دیا جائے تو ان کے آتش فشاں کا لاوا اُبل پڑتا ہے ——— دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک حادثہ وہ ہوتا ہے جب جہالت، میدانِ عمل میں اُتر آئے!

مذہب، اس قسم کے وقتی ہنگامے تو برپا کرا سکتا ہے، دوام اس کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ مذہب پرست قومیں، اہلِ فکر و عمل قوموں سے کوسوں پیچھے ہوتی ہیں۔ وہ قومیں، ہر آن آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن مذہب پرست قوم اپنے مقام پر کھڑی، عمودی حرکت میں مصروف رہتی ہے اور اس سعی لاحاصل سے تھک کر، مرورِ زمانہ کے ہاتھوں، غبارِ کارواں کی طرح، خاک نشیں ہو جاتی ہے، اور ——— قرآن کے الفاظ میں، نہ آسمان ان کے غم میں روتا ہے، نہ زمین ان کی موت پر آنسو بہاتی ہے۔ (۴۴/۲۹)

(۰)

کائنات میں تفکر

پہلے کہا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے تاکید کی ہے کہ "دنیا اور آخرت میں فکر کیا کرو"۔ دنیا سے مراد خارجی کائنات ہے۔ اس کے متعلق اس نے کہا کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵/۱۳)۔

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (ارض و سماوات) میں جو کچھ ہے، خدا نے ان سب کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں (حقیقت تک پہنچنے کی بہت بڑی نشانیاں ہیں)۔

کائنات میں قوانینِ فطرت کارفرما ہیں، جو اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ یہ قوانین انسانی فکر کے وضع کردہ نہیں۔ (خدا کے متعین کردہ ہیں) لیکن انسانی فکر انہیں دریافت کر سکتی ہے۔ اس کے بعد، ان قوانین کی رُو سے، فطرت کی مخفی قوتوں کو منکشف کیا جا سکتا اور انہیں اپنے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ انسانی فکر جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے، تسخیرِ فطرت کے نت نئے گوشے نمودار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جب مذہب، انسانی فکر کو ماضی کی کسی منزل میں ساکن اور منجمد کر دیتا ہے، تو فطرت کے متعلق جو کچھ اُس وقت تک معلوم ہو چکا ہوتا ہے (یا جو نظریات اُس وقت قائم ہوتے ہیں) ان کا علم اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ اگر کوئی مفکر یا سائنسدان، تازہ فکر کی رُو سے کوئی نیا انکشاف کرتا ہے، تو مذہب یہ کہہ کر اس کے خلاف موت کا فتویٰ صادر کر دیتا ہے کہ یہ نظریہ اسلاف کے مسلک کے خلاف، لہٰذا الحاد اور بے دینی ہے۔ یورپ (عیسائیت) کی سولھویں، سترھویں صدی سے پیشتر کی تاریخ اس "معرکۂ مذہب اور سائنس" کی تاریخ ہے۔ اس میں، گیلی لیو یا کوپرنیکس، جیسے سائنس دانوں کو اس جرم کی پاداش میں مستحقِ دار و رسن قرار دیا گیا تھا کہ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ زمین گول ہے یا گردش کرتی ہے۔ اقوامِ مغرب نے تنگ آ کر، آخر مذہب کا لبادہ اتار کر پھینکا تو آج چاند تک کو اپنے زیرِ قدم لانے کے قابل ہو گئیں۔ ان کا پادری تو آج بھی یہ کہتا

ہے کہ کائنات، فلاں سن، فلاں مہینے اور فلاں دن کو وجود میں آئی تھی، لیکن اس کی اس آواز کو گرجے کی چار دیواری سے باہر، درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔

لیکن چونکہ وہ قومیں "آخرت کی زندگی" (خدا کے قانونِ مکافات یا اقدارِ خداوندی) کی قائل نہیں،

اقدارِ حیات

اس لئے وہ جوں جوں، فطرت کی قوتوں کی تسخیر میں آگے بڑھتی جاتی ہیں، باہمی تصادمات سے، انسانی دنیا کو جہنم زار بنائے چلی جا رہی ہیں جس میں خود بھی جلتی ہیں اور باقی انسانیت کو بھی جلاتی ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا!
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا! — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

(یہاں عشق اور فرمانِ نظر سے مراد، اقدارِ حیات اور ان کی صداقت پر یقین ہے)۔

(۰)

قرآن نے "دنیا اور آخرت" دونوں کو فکر کی جولانگاہ قرار دیا ہے۔ "دنیاوی فکر" سے مراد وہ تمام علومِ سائنس ہیں جن کی تحصیل کے لئے اقوامِ مغرب کی (مذہب کی گرفت سے آزاد شدہ) فکر اس قدر مصروفِ سعی و کاوش ہے۔ قرآنِ کریم نے (چھٹی صدی عیسوی میں) ان علوم کی تحصیل کو مومن کی زندگی کا شعار بنایا تھا۔ اس کی تائید میں بکثرت آیات پیش کی جا سکتی ہیں (اور میں، اس سے پہلے، متعدد بار انہیں پیش کر چکا ہوں) لیکن یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ سورۂ فاطر میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ط...... (۳۵/۲۷)۔ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ بارش کا نظام کیا ہے اور انواع و اقسام کی فصلوں، پھولوں اور پھلوں کی پیدائش و افزائش کون سے قوانینِ فطرت کی رو سے ظہور پذیر ہوتی ہے؟ —— آپ غور کیجئے کہ ان دونوں شعبوں کے تحت کس قدر علومِ سائنس آ جاتے ہیں؟

اس کے بعد ہے: وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ○ (۳۵/۲۷)۔ اور کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ پہاڑ، جو نظر بظاہر، چٹانوں کے بے ہنگم انبار دکھائی دیتے ہیں، ان کے مختلف رنگوں کے قطعات —— کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی کالا بھجنگ —— کس قسم کے ارتقائی نظام کی شہادت دیتے ہیں —— آپ دیکھئے کہ اس میں کتنے علومِ سائنس شامل ہو جاتے ہیں؟

ازاں بعد فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ط...... (۳۵/۲۸) اسی طرح انسانوں، دیگر حیوانوں اور مویشیوں پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ ان کی کس قدر اقسام ہیں اور ہر قسم (نوع) کس طرح منفرد خصوصیات کی حامل ہے —— اس کے تحت سائنس کی کس قدر متعدد شاخیں آ جاتی ہیں۔

ان تصریحات کے بعد کہا: اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ ۝ (۳۵/۲۸) صمیمِ فطرت کے یہ ادراق، یوں تو سب کے سامنے کھلے رہتے ہیں، لیکن ان قوانین کی عظمت کے سامنے وہی لوگ جھکتے ہیں جو ان پر علم و بصیرت کی رُو سے غور و فکر کرتے ہیں۔ یہی لوگ "علماء" کہلانے کے مستحق ہیں۔

آپ سوچئے کہ ان آیات میں، علماء کا ترجمہ سائنٹسٹ (SCIENTISTS) کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟ دین میں عالم، سائنسدان ہی کو کہتے تھے۔

لیکن جب دین (اسلام) مذہب میں بدل گیا تو فکر کے دروازے بند کر دیئے گئے، اور علومِ سائنس کو کفر اور الحاد قرار دے دیا گیا۔ کائنات کے متعلق جو تصورات اس زمانے میں عام تھے جب فکر کو منجمد کیا گیا، وہ حرفِ آخر قرار پا گئے اور ان کے خلاف سوچنے یا کچھ کہنے کو ارتداد ٹھہرا دیا گیا ——— (مثلاً مذہب کا ارشاد ہے کہ) سب سے پہلا انسان، مٹی کا ایک پُتلا تھا جس کی پسلی چیر کر اس میں سے ایک عورت نکالی گئی اور ان دونوں کے اختلاط سے نسلِ انسانی کا سلسلہ آگے بڑھا۔ اس پہلے انسان (حضرت آدمؑ) کا قد ساٹھ گز کا تھا۔ آسمان شیشے کا ڈلا ہے جس میں (ستارے) جواہرات کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ سورج، شام کو خدا کے عرش کے نیچے چھپ جاتا ہے جہاں سے فرشتے اسے دوسری صبح نکالتے ہیں۔ دوزخ کا منہ باندھا ہوا ہے اور اُسے سال میں صرف دو سانس لینے کی اجازت ہے۔ جب وہ سانس باہر کی طرف لیتا ہے تو گرمی کا موسم آجاتا ہے، جب اندر کھینچتا ہے تو سردی کا موسم آجاتا ہے۔ زمین چپٹی ہے اور ساکن۔ بنی اسرائیل کے جو اسباط (قبائل) گم ہو گئے تھے، وہ چوہوں کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ (یہ بخاری کی احادیث ہیں) اگر کوئی شخص ان سے انکار کرے تو اسے دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس فکری جمود کا نتیجہ ہے کہ اقوامِ عالم کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہیں، اور ہم زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے دست نگر ہیں۔ اتنا ہی نہیں کہ ہم خود علومِ سائنس کی تحصیل نہیں کرتے۔ سائنس کی رُو سے جو نئی ایجاد دُنیا کے سامنے آتی ہے، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس سے مستفید ہونے کو بھی ناجائز قرار دے دیا جاتا ہے ——— ریڈیو کا استعمال ناجائز ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھنا بھی گناہ ہے کیونکہ اس میں چلتی پھرتی انسانی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ ٹیلی فون میں شیطان بولتا ہے۔ مردہ کی آنکھوں کو اندھوں کی پیشانی میں پیوند کرنا ناجائز ہے۔ اسی طرح دیگر اعضا کی پیوند سازی (تقلیم) بھی ناجائز ہے۔ جب مغربی خلانورد چاند پر پہنچے ہیں، تو ہمارے مذہبی حلقوں کی طرف سے آوازیں بلند ہوئی تھیں کہ یہ دعویٰ بالکل باطل ہے۔ چاند ایسا ہے ہی نہیں کہ اس پر کسی انسان کا پاؤں ٹک سکے۔ حضورؐ نے اپنی انگلی کے اشارے سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔ ایک ٹکڑا آپؐ کی دائیں بغل کے نیچے سے نکل گیا تھا۔ دوسرا ٹکڑا بائیں بغل کے نیچے سے۔ وقس علیٰ ھذا۔ ان "نظریات" کو پیش کرنے والے ہمارے ہاں "علماء" کہلاتے ہیں۔ آپ غور فرمائیے کہ دین کے علماء اور مذہب کے علماء میں کس قدر تفاوت ہے؟

(۰)

فکرِ آخرت

اب آیئے "فکرِ آخرت" کی طرف۔ کارگہِ کائنات میں فکری جمود کا نتیجہ تو متاعِ فطرت سے محرومی اور حرماں نصیبی ہے۔ اُخروی زندگی سے متعلق امور میں فکر (سوچ) کے شجرِ ممنوعہ قرار پا جانے سے ہم نہ دین کے رہے نہ دنیا کے۔ اُخروی زندگی میں غور و فکر کے لئے قرآنِ کریم نے ایک ایسے نظامِ معاشرہ کے قیام کو ضروری قرار دیا تھا جس کی عمارت اقدار و اصولِ خداوندی پر استوار ہوتی ہے۔ ان اقدار و اصول کی کیفیت یہ ہے کہ

(۱) قوانینِ فطرت کی طرح، یہ اقدار و اصول بھی فکرِ انسانی کی تخلیق نہیں۔ خدا کے متعین فرمودہ ہیں۔

(۲) یہ بھی قوانینِ فطرت کی طرح، غیر متبدل اور ابدی ہیں۔

(۳) قوانینِ فطرت کو انسانی فکر دریافت کر سکتی ہے لیکن یہ اقدار و اصول وحی کے ذریعے، بوساطت انبیاء کرامؑ انسانوں کو دیئے جاتے تھے۔ اب یہ اپنی آخری، مکمل اور غیر متبدل شکل میں، قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ انسانی غور و فکر ان کی صداقت کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں۔

(۴) قوانینِ فطرت اور اقدارِ وحی کی کارفرمائی کا انداز یکساں ہے۔ قوانینِ فطرت، محکم اصولوں کی طرح اپنے مقام پر اٹل رہتے ہیں، اور انسانی فکر ان کی روشنی میں نت نئے نظریات وضع کرتی۔ نئے نئے انکشافات کرتی اور انواع و اقسام کی ایجادات ظہور میں لاتی رہتی ہے۔ اسی طرح، وحی خداوندی کی رُو سے جو نظامِ معاشرہ قائم ہوتا ہے، اس میں یہ اقدار، غیر متبدل حدود کا کام دیتی ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، یہ نظام، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، عملی جزئیات مرتب کرتا ہے جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان اقدار پر عمل کس طرح کیا جائے۔ جوں جوں زمانے کے تقاضوں میں تبدیلیاں رونما ہوں گی اور انسانی فکر آگے بڑھتی جائے گی، ان عملی جزئیات میں تبدیلیاں ہوتی جائیں گی، البتہ اقدار کی رُو سے متعین شدہ حدود اپنی جگہ محکم رہیں گی۔ ان عملی جزئیات کو (اصطلاح میں) احکامِ شریعت کہا جاتا ہے اور جس فکری طریق سے ان میں حک و اضافہ، اور ترمیم و اصلاح کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اسے اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے ——— اجتہاد کے معنی ہیں فکری جدوجہد ——— وہی فکر جس کی اس قدر تاکید کی گئی ہے۔

فکر منجمد ہو گئی

جب اسلام، دین کی شکل میں قائم تھا تو اس میں اسلامی نظام کا یہی نقشہ تھا۔ یعنی خدا کی مقرر کردہ اقدار (حدود) کے اندر رہتے ہوئے فکر کی کارفرمائی۔ اس کے بعد جب اسلام، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس کی رُو سے:۔

(۱) انسانی فکر اُس زمانے کی سطح پر پہنچ کر جامد ہو گئی جس زمانے میں دین، مذہب میں تبدیل ہوا تھا اور

(۲) اس کے ساتھ ہی اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا اور انسانی فکر نے جو احکامِ شریعت اس زمانے میں وضع کئے تھے، انہیں ابدی اور غیر متبدل قرار دے دیا گیا۔ انہیں فقہی احکام کہا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی، بہ حیثیتِ مجموعی، عباسیوں کے دورِ ملوکیت میں رونما ہوئی تھی۔ ان احکام پر ملوکیت کی چھاپ کا لگنا ناگزیر تھا۔

اس وقت سے لے کر اب تک یہ قوم، دنیاوی (کائناتی) اور اُخروی (اقدارِ خداوندی) دونوں امور سے متعلق، اُسی مقام پر کھڑی ہے جہاں اِس کی فکر مفلوج اور جامد ہوئی تھی۔ اب اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار یہ ہے کہ جو معتقدات اور نظریات، یا احکام و شعائر، ان معتقدات و احکام کے مطابق ہوں جو اُس

زمانے میں رائج تھے، انہیں اسلامی قرار دیا جاتا ہے۔ جو ان سے مختلف ہوں، انہیں غیر اسلامی۔ یعنی اب اسلام، اقدار و اصولِ خداوندی کی حدود کے اندر زندگی بسر کرنے کا نام نہیں۔ ان عقائد کا معتقد اور اُن احکام کا پیرو ہونے کا نام ہے جو ملوکیتِ عباسیہ کے زمانے میں وضع ہوئے یا رائج تھے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اسے فقہی مسلک کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں اس نکتہ پر غور کیجئے کہ فقہ (تفقہ) کے معنی غور و فکر کرنا ہیں۔ لیکن اب فقہی احکام انہیں کہا جاتا ہے جن میں غور و فکر حرام ہے۔

(۰)

فقہ کے احکام، انسانوں کے مرتّب کردہ تھے۔ وہ حضرات (فقہا) کتنے ہی بلند مرتبہ بزرگ اور ماہرینِ قوانین کیوں نہ ہوں، لیکن تھے تو بالآخر انسان ہی۔ اللہ تعالےٰ نے صرف اپنے قوانین (کلمات اللہ) کو غیر متبدّل قرار دیا ہے۔ (۶/۱۱۶)۔ لہٰذا، انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدّل قرار دینا، انہیں خدائی درجہ دے دینا ہے جو بالبداہت شرک ہے۔

شخصیت پرستی

قرآن کی بنیادی حقیقت یہ بھی ہے کہ اس نے شخصیتوں کو ختم کر کے، صرف خدا کی حاکمیت کو باقی رکھا۔ دیکھئے، وہ کس قدر واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں..... خواہ اسے مقننہ کے اختیارات حاصل ہوں اور خواہ انتظامیہ کے۔ حتّٰی کہ وہ نبی بھی کیوں نہ ہو۔ کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم اس کتاب کی محکومیت اختیار کر کے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو، اور جس پر تم غور و خوض کرتے ہو، اللہ والے بن جاؤ۔

انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو ابدی (غیر متغیّر) قرار دینے میں عملی نقص یہ ہے کہ ہزار سال پہلے کے زمانے کے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وضع کردہ قوانین، اُس زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوں تو کرتے ہوں، ہزار سال بعد کے زمانے کے تقاضوں کو کبھی پورا نہیں کر سکتے۔ وہ اس قدر بدلے ہوئے ماحول میں فِٹ ہی نہیں بیٹھ سکتے۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کا تجربہ تو ہم نت نئے دن کرتے رہتے ہیں۔ مسودۂ قانون پر بڑے غور و فکر کے بعد مرتّب ہوتا ہے۔ پارلیمان میں سینکڑوں اراکین کے اجلاس میں وہ معرضِ بحث میں آتا ہے۔ دو دو تین تین دفعہ اُسے دہرایا جاتا ہے۔ اس میں کئی ترامیم کی جاتی ہیں۔ حکومت میں ماہرینِ قانون کا ایک خاص شعبہ اس کے ایک ایک لفظ کی چھان بین کرتا ہے۔ اتنی چھلنیوں میں سے چھننے کے بعد، وہ آخری شکل اختیار کرتا ہے۔ لیکن ہنوز وہ پریس میں ہوتا ہے کہ اس کی ترمیم شائع کرنی پڑ جاتی ہے۔ یہ ہے انسانی قانون سازی کی کیفیت۔ ہزار سال پہلے تو قانون سازی کے سلسلہ میں اس قدر اہتمامات کا تصوّر تک نہیں تھا۔ لہٰذا، اس زمانے کے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو ابدی طور

پر غیر متبدّل قرار دے دینا، عقیدت مندانہ جذبات کی تسکین تو کر سکتا ہے۔ عملی زندگی میں ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔

ابتداءً فقہی قوانین سے اختلاف قابلِ اعتراض نہیں تھا۔ علامہ اقبالؒ کی تحقیق کی رُو سے، چوتھی صدی ہجری کے آغاز تک، قریب انیس مختلف مراکزِ فقہ وجود میں آچکے تھے ؂ ان میں سے متعدد (حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی وغیرہ) اب بھی باقی ہیں۔ لیکن بعد میں جب، اسلاف کے مسلک کو دین بنا دیا گیا اور فکر پہ پہرے بٹھا دیئے گئے، تو ہر فرقہ نے اپنی فقہ کو محفوظ اور مستحکم رکھنے کے لئے، اسے مقدس بنا دیا اور اس سے ذرا سے اختلاف کو خلافِ اسلام قرار دے دیا۔

آپ شاید دل میں سوچتے ہوں کہ جب اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ ان قوانین کے واضعین بہرحال انسان تھے، تو ان کے وضع کردہ قوانین کو یہ حیثیت دی کیسے گئی؟ یہ نقطہ واقعی اہم ہے اور گہرے غور و فکر کا محتاج! انہیں یہ حیثیت اس طرح حاصل ہو گئی کہ ان کے متعلق کہا گیا کہ یہ قوانین ان فقہا کے خود وضع کردہ نہیں بلکہ نبی اکرمؐ کے ارشادات (احادیث) پر مبنی ہیں۔ لہٰذا ان قوانین سے اختلاف یا ان کا انکار، احادیث یا سنّتِ رسول اللہؐ سے انکار کے مرادف ہے۔ اور یہ کفر ہے۔ ان قوانین کی حضورؐ کی طرف نسبت سے، اب سوال فکر سے متعلق نہ رہا، جذبات سے وابستہ ہو گیا۔ اور جو سوال جذبات سے وابستہ ہو جائے، اس کی تقدیس، تنقید کی حد سے ماورا ہو جاتی ہے۔ یہ مقام بڑا نازک ہوتا ہے۔ عرفی بخاری کے الفاظ ہیں :-

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

منکرِ حدیث

نتیجہ اس کا یہ کہ جونہی کسی نے کسی فقہی فیصلہ سے اختلاف کیا، یا اس پر اعتراض کیا، اس کے متعلق مشہور کر دیا کہ وہ منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ سنّتِ رسول اللہؐ ہے۔ اس سے عوام کے جذبات جس قدر مشتعل ہو سکتے ہیں، ظاہر ہے۔ یہ ہے وہ ٹیکنیک جس سے فقہی عقائد و احکام کو تنقید کی حد سے بالا تسلیم کرایا جاتا ہے۔

یہ واقعی بڑا نازک مقام ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ ان حضرات کے جذبات کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، یہ واضح کر دوں کہ انکارِ حدیث یا انکارِ سنّت کی حقیقت کیا ہے، اور جسے حدیث یا سنّتِ رسول اللہؐ سے انکار کہا جاتا (یا مشہور کیا جاتا) ہے وہ درحقیقت کس چیز کا انکار ہوتا ہے۔ اس مقام پر میرا مخاطب وہ طبقہ ہے جو سوچ سے کام لینا چاہے۔ نہ کہ وہ جو جذبات میں بہہ جانا چاہے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ الْعَظِيمِ۔

(۰)

؂ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب اُمّت کی مرکزیت (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) ختم ہو چکی تھی۔ مرکزیت کے زمانے میں انفرادی فقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا، جیسے آج بھی کسی با ضابطہ حکومت کی موجودگی میں انفرادی قانون سازی کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔

میں سب سے پہلے اپنے اس ایمان کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ

میرا ایمان جو شخص رسول اللہؐ کے کسی ارشاد یا حضورؐ کے کسی عمل کی صداقت سے انکار کرتا ہے، میرے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا۔

اس لئے کہ حضورؐ کے ارشادات و اعمالِ حسنہ سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا ہے۔ اس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اُسوہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ معترضین جسے انکارِ حدیث یا انکارِ سنّت کہہ کر، کفر و الحاد قرار دیتے ہیں، وہ (درحقیقت) انکار ہوتا کس بات سے ہے؟ اس کے لئے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ حدیث یا سُنّت کی صحیح پوزیشن کیا ہے!

اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ

(۱) حضور نبی اکرمؐ نے اپنے ارشادات کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے اُمّت کو نہیں دیا۔ نہ ہی کسی کے مرتب کردہ مجموعہ پر مہرِ تصدیق ثبت فرمائی۔ حضورؐ نے اُمّت کو صرف خدا کی کتاب (قرآن مجید) دی۔

(۲) نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے ان ارشادات (احادیث) کا کوئی مجموعہ مرتب کیا۔

(۳) حضورؐ نبی اکرم کی وفات کے قریب دو سو سال بعد، بعض حضرات نے اپنے طور پر کوشش کی کہ جن باتوں کو لوگ، حضورؐ کے ارشادات کہہ کر بیان کرتے تھے، انہیں اکٹھا کیا جائے۔ اس میں سرفہرست وہ چھ حضرات ہیں جن کے مجموعوں کو سُنّی حضرات "صحاح ستہ" کہہ کر پکارتے ہیں۔ (شیعہ حضرات کے مجموعے الگ ہیں)۔ (ضمناً) یہ سب جامعینِ احادیث ایرانی تھے۔ ان میں عرب تھا کوئی نہیں تھا۔ میں ان میں سے، صرف ایک بزرگ، امام بخاریؒ (متوفی ۲۵۶ھ) کے نام سے متعین گفتگو کروں گا۔ لیکن جو کچھ ان کے متعلق کہا جائے گا، اس کا اطلاق باقی جامعینِ احادیث پر از خود ہو جائے گا۔

امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ انہوں نے جو روایات لوگوں کی زبانی سُن کر اکٹھی کیں ان کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچتی ہے[۱]۔ ظاہر ہے کہ جنہوں نے یہ روایات امام بخاریؒ سے بیان کیں وہ امام صاحبؒ کے زمانے میں موجود تھے۔ لیکن ان کے اور رسول اللہؐ کے زمانے میں قریب دو سو سال کا بُعد (فاصلہ) تھا۔ اس لئے ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے یہ بات خود رسول اللہؐ سے سُنی تھی۔ وہ کیا کہتے تھے؟ وہ یہ کہتے تھے کہ میں نے یہ بات فلاں سے سُنی تھی، اور اس نے فلاں سے

---

[۱] امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد سات لاکھ سے اوپر ہے۔ امام یحییٰ بن معینؒ بارہ لاکھ حدیثوں کے مالک تھے۔

اور اس طرح متعدد راویوں کا سلسلہ صحابہ کرامؓ یا رسول اللہؐ تک پہنچا دیا جاتا تھا۔

اگر کسی عدالت میں، ایک گواہ یہ کہے کہ میں نے اس واقعہ کو خود نہیں دیکھا، میں نے یہ بات فلاں سے سُنی ہے، تو عدالت اس کی گواہی قبول نہیں کرتی۔ آپ سوچیئے کہ جب ایک گواہ کی سُنی سنائی بات کو شہادت تسلیم نہیں کیا جاتا، تو دو سو سال پر پھیلے ہوئے عرصہ کے پانچ سات راویوں کی سُنی سنائی باتوں کو شہادت کیسے کہا جا سکے گا؟

پھر، یہ بھی نہیں تھا کہ سب سے پہلے راوی نے رسول اللہؐ کے الفاظ اگلے راوی تک منتقل کر دیئے ہوں۔ اس نے حضورؐ کے ارشاد کا جو مطلب سمجھا اسے آگے منتقل کیا۔ اس طرح ہر راوی نے، سابقہ راوی کے بیان کا جو مطلب سمجھا، اسے آگے بیان کر دیا، اس طرح یہ، مطلب در مطلب مختلف راویوں کی زبانی، امام بخاریؒ تک پہنچا۔

آپ کسی محفل میں بیٹھے ہوئے دس احباب میں سے اپنے قریب ترین دوست کے کان میں کوئی بات کہیئے۔ وہ اسے اپنے الفاظ میں اگلے دوست تک پہنچائے۔ وہ اگلے تک۔ اس کے بعد وہ بات آپ تک واپس پہنچے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کی بات کیا سے کیا بن کر آپ تک پہنچتی ہے؟ یہ ایک ہی وقت میں ایک ہی نشست میں مطلب کے تفاوت کی مثال ہے۔ آپ سوچیئے کہ جب کسی بات کا مطلب، راویوں کے اپنے الفاظ میں، دو سو سال کے عرصہ میں، جامع روایات تک پہنچے تو اس کی اصل سے کیا نسبت رہ جائے گی۔

اس طرح چھ لاکھ احادیث امام بخاریؒ تک پہنچیں۔ انہوں نے ان میں سے، قریب سات ہزار کو قابل قبول سمجھا اور باقی حدیثوں کو مسترد کر دیا۔ ان میں سے اگر مکررات کو نکال دیا جائے تو باقی قریب تین ہزار روایات رہ جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ امام بخاریؒ کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ خود ذاتِ رسالتمآبؐ سے تصدیق کر لیتے کہ فلاں روایت فی الحقیقت آپ کی ہے! امام بخاریؒ نے اپنے خیال یا اپنی رائے میں جن روایات کو قابلِ قبول سمجھا، انہیں اپنے مجموعہ میں شامل کر لیا۔ جنہیں اپنے خیال میں صحیح نہ سمجھا انہیں مسترد کر دیا۔ ایسے معاملات میں انسان کے خیال یا رائے یا عقیدے کا کس قدر گہرا اثر ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس ایک مثال سے لگایئے کہ امام بخاریؒ کو اس مسئلہ میں کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں، امام اعظمؒ (امام ابوحنیفہؒ) سے اختلاف تھا۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ امام اعظمؒ کو ثقہ قرار نہیں دیتے۔ پھر یہیں تک بس نہیں۔ چونکہ امام اعظمؒ کوفہ کے رہنے والے تھے اس لئے امام بخاریؒ کے نزدیک، تمام اہلِ کوفہ غیر معتبر قرار پا گئے۔ چونکہ کوفہ عراق میں ہے اسلئے عراق والے بھی اسی زمرہ میں شمار ہو گئے اور انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ عراق والوں کی سو حدیثوں میں ننانوے چھوڑ دو۔ جو ایک رہ جائے اسے بھی مشتبہ سمجھو۔ اسی طرح ایک فرعی عقیدہ کے اختلاف کی بنا پر، دو جلیل القدر ائمہ، یعنی امام ابوزرعہؒ اور امام ابوحاتمؒ نے خود امام بخاریؒ کی ثقاہت پر اعتراض کیا ہے۔ بخاریؒ اور مسلمؒ کے مجموعوں کو صحیحین کہا جاتا ہے۔ ان کی آپس میں یہ کیفیت ہے کہ امام مسلمؒ، امام بخاریؒ کی ثقاہت پر طعن کرتے ہیں۔

اس کے بعد جامع حدیث کے ذاتی مسلک کی طرف آیئے۔

روایات کا انتخاب

جناب عبدالصمد صارم کا ایک مقالہ، سیرتِ امام بخاریؒ کے عنوان سے، دہلی سے شائع ہونے والے اخبار "آستانہ" کی جون ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں چھپا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ

(۱) امام صاحبؒ کو جو مال ان کے والد سے ترکہ میں ملا، وہ اسے مضاربہ کے طور پر دوسروں کو دے دیا کرتے تھے۔ جو منافع ہوتا اس سے بسر اوقات کرتے اور اپنا سارا وقت تحصیلِ حدیث میں صرف کیا کرتے تھے۔ (صفحہ ۳۲)

مضاربہ کے معنی ہیں (SLEEPING PARTNERSHIP) یعنی سرمایہ لگا کر اس کا منافع لینا۔

(۲) امام صاحبؒ کو غلاموں کی تجارت میں پانچ سو درہم ماہانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ (صفحہ ۳۳)

ظاہر ہے کہ جب امام صاحبؒ نے حدیثوں کا انتخاب کیا تو ان حدیثوں کو صحیح قرار دیا جن میں مضاربت اور غلاموں کی تجارت کو جائز کہا گیا ہو۔ اور ان دو ایک عقائد پر ہی کیا موقوف ہے، ظاہر ہے کہ انہوں نے انہی روایات کو قابلِ قبول قرار دیا جو ان کے عقائد اور مسلک کے مطابق تھیں۔

سو پہلی بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ (اور اسی طرح ہر جامع احادیث) نے انہی روایات کو صحیح قرار دیا جو ان کی رائے میں قابلِ قبول تھیں۔

(۰)

اربابِ جرح و تعدیل

اس کے بعد کچھ اربابِ فن نے یہ سوچا کہ اس امر کی تحقیق کی جائے کہ جن راویوں نے یہ روایات بیان کی ہیں، وہ قابلِ اعتماد (ثقہ) بھی تھے یا نہیں! یہ خیال تو اچھا تھا لیکن آپ سوچیے کہ ان کے پاس وہ کونسے ذرائع تھے جن کی بنا پر وہ ڈیڑھ، دو سو سال پہلے کے انسانوں کے متعلق یقینی طور پر معلوم کر سکتے کہ وہ کیسے تھے؟ ظاہر ہے کہ اس تحقیق میں انہیں جو (MATERIAL) بھی میسر آیا، وہ اسی کی بنا پر ان راویوں کی ثقاہت یا عدمِ ثقاہت کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکتے تھے؛ یہاں معیار پھر ان کی "رائے" قرار پا گئی۔ اس باب میں سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کہتے ہیں:-

> جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہو، وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو۔ اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو اور اس کی تمام روایتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہوں۔ پھر ایک ایک راوی کے حافظہ اور نیک نیتی اور صحتِ ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو مشکل ہے۔
>
> (تفہیمات۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۳۲۱)

اسماء الرّجال

اس کے بعد، بعض اربابِ فن نے اس امر کی تحقیق کی کوشش کی کہ راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے، آیا وہ اس کا ہم عصر بھی تھا یا نہیں۔ ہم عصر تھا تو وہ

اس سے ملا بھی تھا یا نہیں۔ ملا تھا تو کیا اس نے یہ خاص حدیث اُس سے سُنی تھی یا کسی اور سے سن لی تھی۔ ان کی تحقیق کے متعلق بھی مودودی مرحوم نے کہا ہے کہ

> اسے کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنتِ نبویؐ اور آثارِ صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے۔ مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳۲۲)

اربابِ جرح و تعدیل اور اسماء الرجال نے، راویوں کی ثقاہت کے متعلق جو رائے قائم کی، اس کی رُو سے انہوں نے احادیث کے مختلف درجے مقرر کر دیئے۔ کسی کو صحیح کہا۔ کسی کو حسن، کسی کو ضعیف وغیرہ۔ ان میں "صحیح" کی اصطلاح بڑی مغالطہ آفریں ہے۔ سُنیوں کی احادیث کے چھ مجموعوں کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ یعنی صحیح حدیثوں کے چھ مجموعے۔ بخاریؒ اور مسلمؒ کو صحیحین۔ اور بخاریؒ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ۔ ان کی حدیثوں کو صحیح کہنے سے عام طور پر، ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ یقینی طور پر صحیح، یعنی رسول اللہؐ کے مستند ارشادات ہیں۔ لیکن درحقیقت بات یہ نہیں۔ یہ صرف محدثین کی اصطلاح کے طور پر صحیح کہلاتی ہیں۔ یقینی طور پر ان کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اقوالِ رسول اللہؐ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو ہر حدیث کے آخر میں یہ لکھا ملے گا —— "او کما قال رسول اللہؐ" —— یوں، یا جیسے رسول اللہؐ نے فرمایا ہو!

(۵)

حدیث کا مقام

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ جس طریق سے یہ احادیث جمع اور مرتب ہوئی ہیں اس کی رُو سے، کسی ایک حدیث کے متعلق بھی حتمی اور یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ارشادِ رسول اللہؐ ہے۔ اس کے متعلق یہی کہا جا سکے گا کہ وہ نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کردہ قول ہے۔ مودودی مرحوم کے الفاظ ہیں:۔

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہو، اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا، بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (یعنی معتقدین حدیث) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول ماننا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل۔ سنہ ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صفحہ ۲۹)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

> قولِ رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآنی کا ہم پلّہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں۔ بخلاف اس کے، روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی (صلعم) کی طرف منسوب کیا گیا ہے،

وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۷)

(ضمناً) میں بھی یہی کہتا ہوں جو مودودی (مرحوم) کہتے ہیں۔ لیکن یہ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ مودودی مرحوم کو منکرِ حدیث نہیں کہا جاتا اور میرے منکرِ حدیث ہونے کا ڈھنڈورا اس زور سے پیٹا جاتا ہے کہ اس کی آواز دُور دراز گوشوں تک پہنچتی ہے۔ اور ان ڈھنڈورا پیٹنے والوں میں خود مودودی (مرحوم) اور ان کی جماعت بھی شامل ہوتی ہے!

بہرحال یہ ہے احادیث کی صحیح پوزیشن۔ لیکن ان کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ

دوسری طرف

تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے۔ اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا..... جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنّت کی تصریحات کے مطابق صحیح ہوں..... ان کا انکار کفر ہوگا اور ملّت سے خروج کے مرادف..... بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر اُمت متفق ہے..... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔

(جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث۔ از مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) سابق صدر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث۔ صفحہ ۴۵ تا ۵۵)

یعنی بخاری یا مسلم کی کسی ایک حدیث کے انکار سے بھی ایک مسلمان کافر ہو جاتا ہے اور ملّت کے دائرے سے خارج قرار پاتا ہے۔ (مثلاً) بخاری کی حدیث ہے کہ "جب ملک الموت، حضرت موسےٰؑ کی جان قبض کرنے کے لئے آیا تو انہوں نے اسے ایسا تھپڑ مارا کہ وہ لوٹ کر خدا کے پاس چلا گیا۔" (کتاب الانبیاء) اگر آپ اس حدیث کے صحیح ہونے سے انکار کر دیں، تو (مذکورہ بالا فیصلہ کی رُو سے) آپ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔

(۰)

انکارِ حدیث کے معنی!

اس کے بعد ہمیں اس نقطہ کی طرف آجانا چاہیئے کہ انکارِ حدیث کے معنی کیا ہیں؛ یعنی جو شخص کسی حدیث کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہے، وہ کس بات سے انکار کرتا ہے؟

آپ چند صفحات پیچھے چلئے جہاں میں نے کہا ہے کہ امام بخاریؒ نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے ان تین ہزار حدیثوں کو منتخب کر کے اپنے مجموعہ میں شامل کیا جو ان کی رائے میں قابلِ قبول تھیں۔ اب اگر ایک شخص کہتا ہے کہ، میرے نزدیک فلاں حدیث صحیح نہیں، تو وہ رسول اللہؐ کے کسی ارشادِ گرامی کے صحیح ہونے سے انکار نہیں کرتا۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ میرے نزدیک، امام بخاریؒ کی یہ رائے (یا خیال، یا فیصلہ) کہ یہ حدیث قابلِ قبول ہے، صحیح نہیں۔ مجھے ان کی رائے سے اختلاف ہے۔ میں اسے قولِ رسولؐ قرار دینے کے لئے تیار نہیں کیونکہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔

لہٰذا، انکارِ حدیث، رسول اللہؐ کے قول سے انکار نہیں۔ امام بخاری کی

رائے سے اختلاف ہے۔

آپ سینے پر ہاتھ رکھ کر دیانتداری سے کہیئے کہ اس میں کونسی بات ایسی ہے جس سے کفر لازم آجائے — اللہ تعالیٰ نے ہمیں کہیں بھی امام بخاریؒ کی اصابتِ رائے پر ایمان لانے کا مکلّف قرار نہیں دیا[1]۔ یعنی اس نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اگر تم یہ مانو گے کہ امام بخاریؒ کی آراء بالکل صحیح اور صائب ہیں، تو تم مسلمان کہلاؤ گے۔ اگر کہو گے کہ مجھے ان کی رائے سے اختلاف ہے تو تم دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاؤ گے۔ ایسا کہنا خالص شخصیت پرستی ہے اور کلیتہً جذبات پر مبنی ہے۔ کسی انسان کی اصابتِ رائے پر ایمان لانا، نہ قرآن کا تقاضا ہے، نہ عقل و فکر کا مطالبہ۔

لیکن قوم ہے کہ جذبات کے ان طوفانوں میں بہے چلی جاتی ہے کہ جونہی کسی نے امام بخاریؒ کی رائے سے اختلاف کیا، اسے کافر اور مرتد قرار دے دیا۔ اور یہ طوفان متلاطم کردہ ہیں مذہبی پیشوائیت کے مسلسل پروپیگنڈہ کے!

اس کے بعد ہم اس نکتہ کی طرف آتے ہیں کہ اس غلط عقیدہ کا قوم کی عملی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے، اور پڑ رہا ہے۔ یہ نکتہ بھی گہرے فکر و تدبر کا محتاج ہے۔

———— (٠) ————

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ فقہی احکام کس طرح مرتب ہوئے تھے اور انہیں کس طرح ابدی اور غیر متبدل قرار دے دیا گیا۔ یعنی ان کی بنیاد احادیث پر رکھ دی، اور جب احادیث کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے دیا گیا تو فقہی قوانین کی حیثیت خود بخود ایسی ہو گئی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ فقہی احکام (مودودی مرحوم کے الفاظ میں) "منجمد شاسترز" بن کر رہ گئے، بلکہ اس سے اُمّت میں اس قدر تفرقہ پیدا ہو گیا جو کسی صورت میں مٹ ہی نہیں سکتا۔

قرآنِ کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی تھی کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ (۴/۸۲) اس کے برعکس احادیث کی یہ حالت ہے کہ مختلف مجموعوں کے باہمی تضادات اور اختلافات تو ایک طرف، اس کے کسی ایک مجموعہ میں باہمدگر متضاد احادیث موجود ہوتی ہیں۔

فقہ کے اختلافات

آپ غور فرمایئے کہ جب فقہی احکام کی بنیاد احادیث قرار پا جائے، اور احادیث میں اس قدر اختلاف ہو، تو فقہی احکام میں کس قدر اختلاف ہو گا؟ اُمّت میں اس قدر فرقے اور ان میں باہمی سر پھٹول سب اسی کا نتیجہ ہے۔ احادیث، مختلف فقہی احکام میں سے ہر ایک کو کس طرح سند مہیا کر دیتی ہیں، اس کی ایک مثال، علامہ محمد اسلم جیراجپوریؒ نے اپنی کتاب "ہمارے دینی علوم" (ص ۱۲۳) میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

روایات کا یہ اختلاف دیار و امصار، یعنی حجاز و عراق وغیرہ پر محدود نہیں ہے بلکہ ایک ہی مقام میں

---

[1] نیز اربابِ جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کی آراء اور فیصلوں کے صحیح ہونے پر ایمان کا مکلّف!

مختلف اور متضاد روایتیں ہوتی تھیں۔ اس کا ایک نمونہ عبدالوارث بن سعید کا بیان ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "میں مکہ میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہاں عراق کے نامور فقہاء حج کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ پہلے میں امام ابوحنیفہؒ کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ بیع میں بائع اگر کوئی شرط لگائے تو کیا وہ جائز ہوگی؟ جواب دیا کہ بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی۔ پھر میں نے ابن ابی لیلیٰ سے بھی جاکر یہی سوال کیا، انہوں نے کہا کہ بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ اس کے بعد ابن شبرمہ سے جاکر دریافت کیا۔ بولے بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ سبحان اللہ! یہ تینوں فقہا ایک ہی جگہ کے ہیں اور ان میں ایک ہی مسئلہ میں رایوں کا اس قدر اختلاف!

اب دوبارہ میں ابوحنیفہؒ کے پاس گیا اور ان سے یہ سب باتیں کہیں، فرمایا معلوم نہیں کہ وہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں، مجھے تو حدیث ملی ہے:۔

حدثنی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ قال نھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن بیع و شرطٍ۔

یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیع کے ساتھ شرط ممنوع فرمائی۔

یہ سن کر میں ابن ابی لیلیٰ کے یہاں پہنچا اور ان سے بیان کیا انہوں نے کہا کہ حدثنی ھشام عن عروۃ عن ابیہ عن عائشۃؓ قالت امرنی رسول اللہ ان اشتری بریرۃ فاعتقھا فاشترط اھلھا الولاء لانفسھم فقال رسول اللہ ما کان من شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل۔ یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ میں بریرہ کو خرید کر آزاد کردوں۔ اس کے مالکوں نے شرط یہ کی کہ ولا ان کی رہے گی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔

اب ابن شبرمہ کے پاس آیا، انہوں نے سب کچھ سن لینے کے بعد کہا کہ حدثنی مسعر بن کدام عن محارب بن دثار عن جابر قال بعت النبی بعیرا و شرطت لی حملانہ الی المدینہ۔ یعنی میں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ ایک اونٹ بیچا اور میری یہ شرط منظور کی گئی کہ اس پر لد کر مدینہ تک جاؤں گا۔

اس پر، علامہ موصوف نے، اپنے مخصوص انداز میں، چار سطروں میں جو تبصرہ فرمایا ہے، وہ اپنے مقام پر منفرد ہے۔ فرماتے ہیں:۔

مگر اس کا الزام صرف روایات کے اختلاف پر نہیں بلکہ مذہبی انفرادیت پر بھی ہے۔ اگر اجتماعی مرکز، فقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تو ساری ملت کی ایک ہی فقہ ہوتی اور شخصی فقہوں میں پڑ کر وہ فرقوں میں تقسیم ہو جاتی۔ اور اس مرکزیت کی وجہ سے حدیثوں کی بھی یہ حالت نہ ہوتی۔

جب تک قرآنی مملکت (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) قائم رہی، نہ احادیث کے مجموعے مرتّب ہوئے اور نہ ہی مختلف فقہا کی انفرادی فقہیں مرتّب اور رائج ہوئیں۔ یہ سب تباہیاں اس خلافت (مرکز) کے باقی نہ رہنے سے آئیں۔

بہرحال ہم یہ کہہ رہے تھے کہ فقہی احکام کے اختلافی ہونے کی وجہ ... اُن احادیث کا اختلاف ہے جن پر فقہی احکام متفرع ہیں۔ اس باب میں سابقہ ادوار میں مختلف فرقوں میں جو مباحثے اور مناظرے ہوا کرتے تھے، انہیں چھوڑیئے۔ آج کل وفاقی شرعی عدالت مختلف معاملات میں جو فیصلے دیتی ہے انہیں دیکھئے۔ ان میں ساری بحثیں، احادیث کی پوزیشن اور ان کے باہمی (اور قرآن سے) اختلافات کے گرد گردش کرتی ہیں۔ اور اس کے بعد نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ حکومت کی قائم کردہ .... شرعی عدالت ایک فیصلہ دیتی ہے، اور خود حکومت اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دیتی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کا وہ فیصلہ بھی فقہ اور احادیث پر مبنی ہوتا ہے، اور اس کے خلاف اپیل بھی، فقہ اور احادیث پر مبنی!

اس مقام سے یونہی آگے نہ بڑھ جایئے۔ قرآنِ مجید کے الفاظ میں:۔

ایک ایک، دو دو کر کے کھڑے ہو جایئے، اور پھر سوچئے!

علامہ اقبالؒ کی فکر

ایک ... سوچنے والے ذہن نے اس اہم ترین سوال کے متعلق سوچا تھا، اور اپنی قرآنی بصیرت کی روشنی میں اس کا حل بھی بتایا تھا۔ آپ، علامہ اقبالؒ کے "خطبات تشکیلِ جدید" میں چھٹا خطبہ دیکھئے۔ اس میں اس سوال پر بڑی تفصیل گفتگو کی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کا حل بھی بتایا ہے۔ سب سے اہم سوال قانون سازی کا تھا۔ اس باب میں انہوں نے اپنی بحث کو ان الفاظ میں سمٹا کر پیش کیا کہ

> آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے قطعاً یہ نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے ..... قرآن کریم کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

(ضمناً) علامہ اقبالؒ نے یہ خطبات ۱۹۲۸ء میں دیئے تھے جب ان کی فکر پختہ ہو چکی تھی۔ حال ہی میں میری نظروں سے ان کے ایک مقالہ کا اقتباس گذرا ہے جو ماہنامہ مخزن کی اکتوبر ۱۹۰۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ (یوں کہیئے کہ وہ) ہنوز طالب العلم تھے۔ اسے دیکھئے اور پھر اندازہ لگایئے کہ ایک

سوچنے والا ذہن ..... چھوٹی سی عمر میں بھی کس طرح صحیح سمت کی طرف رُخ کرتا ہے۔ انہوں نے اس مقالہ میں کہا تھا:۔

حالاتِ زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب آجانے کی وجہ سے بعض ایسی تمدنی ضروریات پیدا ہوگئی ہیں کہ فقہا کے استدلالات جن کے مجموعے کو عام طور پر شریعتِ اسلامی کہا جاتا ہے، ایک نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔ میرا یہ عندیہ نہیں کہ مسلماتِ مذہب میں کوئی اندرونی نقص ہے، جس کے سبب سے وہ ہماری موجودہ تمدنی ضروریات پر حاوی نہیں ہیں، بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ قرآنِ شریف اور احادیث کے وسیع اصولوں کی بنا پر جو استدلال فقہا نے وقتاً فوقتاً کیے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لیے واقعی مناسب اور قابلِ عمل تھے، مگر جن کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں۔ جس طرح اس وقت ہمیں تائیدِ اصولِ مذہب کے لیے ایک جدید کلام کی ضرورت ہے، اسی طرح قانونِ اسلامی کی جدید تفسیر کے لیے ایک بہت بڑے فقیہہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ و متخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلماتِ مذہب کی بنا پر قانونِ اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب اور منظم کر سکے بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔ (قومی زندگی، مخزن، اکتوبر ۱۹۰۴ء) [1]

فقہ کی اس تشکیلِ نو کے لئے انہوں نے، مملکتِ پاکستان کا تصور دیا۔ اس کا بنیادی مقصد انہوں نے جن مختصر الفاظ میں متعین کیا تھا وہ اربابِ فکر و دانش کے لئے دلیلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ "اس سے اسلام کے دامن سے وہ دھبہ دھو دیا جائے گا جو عربی ملوکیت نے اس پر لگا رکھا ہے"۔ غور کیجئے کہ انہوں نے اسلام کے ماضی (کی تاریخ) اور مستقبل (کے تصور) کو کس طرح چار لفظوں میں واشگاف کر کے رکھ دیا تھا؛

تصورِ پاکستان سے مقصود

لیکن اقبالؒ یہ کہہ کر چلا گیا اور اس کے بعد صورت یہ ہو گئی کہ

زاغوں کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن!

عربی ملوکیت کا وہ نقش جو پہلے ایک دھبہ کی شکل میں تھا، اب مقیاکریسی کے تصدق، خود اس دامن کا جزو بنایا جا رہا ہے۔ روایات اور فقہ کے وہ اصول و احکام جو مرورِ زمانہ کے ہاتھوں رفتہ رفتہ خود ہی مٹتے جا رہے تھے، انہیں حیاتِ نو (NEW LEASE OF LIFE) عطا کی جا رہی ہے۔ معلوم

---

[1] یہ اقتباس پروفیسر بختیار حسین صدیقی کے اس مقالہ سے ماخوذ ہے جو "احیائے اسلام کی فکری اساس" کے عنوان سے ماہنامہ المعارف (لاہور) کی جون ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس کے لئے میں محترم مقالہ نگار اور المعارف کا شکر گذار ہوں۔

نہیں، خدا کی کتاب اور انسانی فکر کو جن نئی زنجیروں میں جکڑا جا رہا ہے وہ اُمّت کے سر پر کب تک مسلط رہیں گی؟ یہ ٹھیک ہے کہ یہ تسلّط ابدیت سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ سوال صرف وقت کا ہوتا ہے۔ لیکن اس دوران میں اسلام جس قدر مسخ ہو چکا ہوگا، اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

سرِدست تو ہم اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ جب بھی قرآن اور انسانی فکر، ان زنجیروں سے آزاد ہوئے، اُمّت کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہوگا کہ روایات، سیرت، تاریخ، تفاسیر، فقہ کا جائزہ' قرآن کی روشنی میں لے۔ جو اس کے مطابق ہو، اسے قابلِ قبول سمجھے، جو اس کے خلاف نظر آئے، اسے مسترد کر دے۔ اور پھر اُمّت کے مشورہ سے، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے' اپنے زمانے کے تقاضوں کے .... مطابق، احکام و قوانین کی تشکیلِ جدید کرے۔ اُس وقت وہ مملکت بھی اسلامی کہلائے گی اور اس کے قوانین بھی احکامِ شریعت۔ لیکن، یہ فریضہ اس انقلابی مردِ مومن کے ہاتھوں ادا ہو سکے گا جو (اقبالؒ کے الفاظ میں) اپنے پیکر میں روحِ عمری رضا لے کر آگے بڑھے اور پوری جرأت و بسالت سے اعلان کرے کہ

حسبنا کتاب اللہ ـــــ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ (چھٹا خطبہ)

نظامِ ربوبیّت

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے)

آپ ایک عرصے سے سُنتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟ مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ:-

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے؟ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں۔

ان کے برعکس

(۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسان کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ بھی بتایا گیا ہے۔

* مارکس نے کس طرح یہ اعتراف کیا کہ اس کا نظام ناقابلِ عمل ہے۔ * ماؤزے تنگ کا فلسفہ اضداد کی بنیادیں کس طرح نااستوار ہیں۔
* ربوٰا (سود) کا مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔ * زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

کتاب، آفسٹ کی چھپائی میں، ولایتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے ـــ ضخامت سوا چار سو صفحات ـــ سنہری جلد
قیمت فی جلد پچاس روپے ـــــ (علاوہ محصول ڈاک)

* ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور ○ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

ادارۂ طلوعِ اسلام کی
مطبوعات کی قیمتیں

نوٹ:۔ اِن قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (کھلے پارے)	روپے	جہانِ فردا	۳۰/-
پارہ نمبر ۱	۶/-	کتاب التقدیر	۳۵/-
پارہ نمبر ۲ تا ۲۸	۴/- (فی پارہ)	معراجِ انسانیت	۵۰/-
پارہ نمبر ۲۹	۵/-	اقبالؒ اور قرآن	۳۰/-
پارہ نمبر ۳۰	۶/-	انسان نے کیا سوچا؟	۴۰/-
مکمل سیٹ (کھلے پارے)	۱۲۵/-	مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	۱۲/-
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ) (مجلد تین جلدوں میں)	۱۵۰/- فی جلد ۵۰/-	اسبابِ زوالِ اُمّت	۵/-
لغات القرآن (مکمل سیٹ) (مجلد چار جلدوں میں)	۱۵۰/- فی جلد ۴۰/-	قائدِ اعظمؒ اور طلوعِ اسلام	۴/-
تبویب القرآن (مکمل سیٹ)	۱۷۵/-	ISLAM A CHALLENGE -- TO RELIGION (H.B)	۵۰/-
مطالب الفرقان (جلد اوّل)	۵۰/-	ISLAM A CHALLENGE -- TO RELIGION (P.B)	۴۰/-
مطالب الفرقان (جلد دوم)	۵۰/-	سلسبیل	۱۵/-
مطالب الفرقان (جلد سوم)	۷۵/-	فردوسِ گم گشتہ	۱۵/-
نظامِ ربوبیت (جدید ایڈیشن)	۵۰/-	ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت (مجلد)	۱۵/-
قرآنی قوانین (جدید ایڈیشن)	۲۰/-	سلیم کے نام خطوط (جلد دوم و سوم)	۱۵/- فی جلد
ابلیس و آدم	۳۵/-	طاہرہ کے نام خطوط	۱۰/-
جوئے نور	۳۰/-	مقامِ حدیث	۱۰/-
شعلۂ مستور	۳۰/-		

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
اسلامی معاشرت	۶/- روپے	قتلِ مرتد	۵/- روپے
قرآنی فیصلے (مکمل ۴ جلدیں)	۴۵/-	تاریخ الامت (مکمل سیٹ ۸ جلدیں)	۴۰/-
(پہلی تین جلدیں، ہر جلد -/۱۰ روپے)			فی جلد ۵/-
جہاد	۵/-	تصنیفات (انگریزی) ڈاکٹر عبدالودود صاحب:-	
عربی خود سیکھئے	۱۰/-	PHENOMENA OF -- NATURE & QURAN (H.B)	۵۰/-
پاکستان کا معمارِ اوّل	۵/-	CONSPIRACIES -- AGAINST QURAN (H.B)	۴۰/-
فجر الاسلام (مکمل دو جلدیں - فی جلد -/۸)	۱۵/-	FOOD & HYGIENE -- IN ISLAM (P.B)	۸/-
منزل بہ منزل	۱۵/-		
پرنسپل آف لا میکنگ اِن اسلام (انگریزی)	۵/-		

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ

یکم جولائی ۱۹۸۱ء سے، بیرونی ممالک کو ترسیلِ ڈاک کی شرح میں ترمیم کے پیشِ نظر ماہنامہ طلوعِ اسلام کے سالانہ چندہ میں کچھ اور اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے، قارئین اسے نوٹ فرمالیں:-

اندرونِ ملک (پاکستان) ---------- ۳۶/- روپے

غیر ممالک بذریعہ بحری ڈاک رجسٹرڈ ---------- ۸۶/- "

غیر ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک رجسٹرڈ :—

(۱) یورپ کے ممالک (برطانیہ، فرانس، سوئٹزرلینڈ وغیرہ) ---------- ۱۳۶/- "

(۲) عرب ممالک (دوبئی، بحرین، کویت، سعودی عرب وغیرہ) ---------- ۱۱۶/- "

(۳) افریقہ کے ممالک (لیبیا، کینیا، یوگنڈا، مصر، جنوبی افریقہ وغیرہ) ---------- ۱۳۱/- "

(۴) امریکہ، کینیڈا وغیرہ ---------- ۱۹۶/- روپے — (۵) نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، جزائر فجی وغیرہ -/۱۸۱ روپے

(۶) انڈیا، برما، سری لنکا، جزائر مالدیپ، وغیرہ ---------- ۱۲۱/- روپے — (۷) بنگلہ دیش -/۱۳۶ "

نوٹ:- ماہنامہ طلوعِ اسلام کے لئے صرف، ادارہ طلوعِ اسلام کو لکھیئے۔

کتابیں ملنے کے پتے:- (۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش۔ اردو بازار لاہور

پرویز صاحب کی شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آسکتا ہے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔

قیمت:- فی جلد -/۴۰ روپے

مکمل سیٹ -/۱۵۰ روپے

تبویب القرآن

آپ کے ذہن میں کوئی سوال آئے اور آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کی بابت قرآن مجید میں کیا اور کہاں کہاں آیا ہے، تو اس کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا۔

اس کتاب میں قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں اور ہر عنوان کے تحت اُن قرآنی آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں اس کے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ کچھ کہا گیا ہے۔ مصنف کی چالیس سالہ محنتِ شاقہ کا ماحصل ہے۔ کتاب بڑے سائز کے ۱۵۱۲ صفحات پر مشتمل ہے عمدہ سفید کاغذ، آفسٹ کی چھپائی۔ تین مضبوط اور دیدہ زیب جلدوں میں۔

قیمت:- مکمل سیٹ -/۱۲۵ روپے

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آسکتا، یہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رُو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن) عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

قیمت:- فی جلد -/۵۰ روپے

مکمل سیٹ مجلد -/۱۵۰ روپے

مطالب الفرقان

پرویز صاحب کے درسِ قرآن مجید کا سلسلہ گزشتہ بیس سال سے جاری ہے۔ اس میں ان کا انداز یہ ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانہ کے محاورۂ عرب اور تصریفِ آیاتِ قرآنی سے آیاتِ قرآنی کی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مسلسل تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ان درسوں کی بنیاد پر قرآن کریم کی تفسیر مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کا نام مطالب الفرقان ہے ابھی تک اس کی تین جلدیں شائع ہوئی ہیں۔

عمدہ سفید کاغذ، پاکیزہ آفسٹ چھپائی۔

قیمت:- جلد اوّل -/۵۰ روپے جلد دوم -/۵۰ روپے جلد سوم -/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ، کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے۔

نوٹ:- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپس بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں۔

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-
لاہور	جمعہ ۸ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱ بجے دوپہر	143 SUTTON COURT RD. LONDON (E-13-9NR) PHONE-01-552-1517
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر	(بمقام) 60, HERICK RD SALTLEY, B8 INT.
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا سنیچر شام ۶ بجے	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-1
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE. #311, DOWNS VIEW. TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P5. PHONE (416) 661-2827
کراچی ۲	ہر جمعہ ۹½ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ نمبر ۲۲ ہارون چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ نیو چالی۔ فون ۲۳۸۸۲۹
پشاور	(۱) ہر جمعہ ۵ بجے شام (۲) ہر جمعہ ۹ بجے صبح	(۱) رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر (OPP Y VIR MANIGATE) پشاور سٹیڈیم (۲) ہوٹل نعمت کدہ۔ یونیورسٹی روڈ۔ جہانگیر آباد۔ فون ۷۶۶۵۹
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب۔ اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر ٹیکنیکل انجینئرنگ ورکس۔ شہید روڈ (لیہ)
ایبٹ آباد	ہر اتوار ۴ بجے شام	دفتر غلام مصطفٰے اعوان ایڈووکیٹ
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی، مکان نمبر ۲۔ نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ۔ غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب
چکوال	ہر جمعہ ۹½ بجے صبح	ضیا ایجوکیشن سنٹر، محلہ ہجویری مسجد۔ نزد تحصیل آفس۔ باہتمام محمد صفدر ملک صاحب
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطے کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ ۵ بجے شام	دفتر بزم ملحق رہائشگاہ :- چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ۔ سول لائنز
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام۔ ۱۲/۱/۱ بی۔ بھمبر روڈ... باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ... ۳۱۰۷۱)
پنجکسی تحصیل کبیر والا ضلع ملتان	ہر جمعہ ۲ بجے سہ پہر	بمقام۔ مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ۵½ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون نمبر ۲۶)
فیصل آباد	ہر جمعہ ۳½ بجے بعد دوپہر	بمقام۔ حیات سرجیکل کلینک ۲۳/۷ پیپلز کالونی نمبر ۱ (فون ۴۲۸۵۵)